اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

اپریل ۲۰۱۷ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

دسمبر

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۱، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۱۷ء/ رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

مشمولات

O فکر و نظر

- ذرا نم ہو تو یہ مٹی — مدیر — ۴

O تعلیم و تبیت

- دینی تعلیم کی موجودہ صورتِ حال (آخری قسط) — ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ — ۸
- بچیوں کی تعلیم ۔ چند غور طلب پہلو — ڈاکٹر محمد امین — ۱۳
- علوم کی اسلامی تشکیل نو — پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق عجمی — ۱۴
علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین ۔ تقابلی جائزہ

O اسلام اور پاکستان

- اسلام اور دہشت گردی کا بیانیہ — مدیر — ۲۹
- پاکستان کا مستقبل ۔ اسلام یا سیکولرزم؟ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۳۶

O فہم دین

انسان عبد ہے یا خلیفہ؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۳۹

O استفسارات

- نہی عن المنکر کون کرے گا؟ — مدیر — ۴۶

O اتحاد امت/توہین رسالت

- راجہ ظفر الحق صاحب سے ایک ملاقات — مدیر — ۴۸

O اسام اور عصر حاضر

- اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیلِ نو — ڈاکٹر انعام اللہ — ۵۱

O تبصرہ کتب

- 'سیکولرزم' مؤلف ڈاکٹر سفر الحوالی — مدیر — ۵۵
- 'جمہوریت اور شورائیت ۔ ایک تقابلی مطالعہ' — ۵۷

فکر و نظر

ممتاز قادریؒ کیس میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں فیصلہ کرنے والو ججو!
سنو اور دیکھو! مسلمان جج کیسا ہوتا ہے!

ذرا نم ہو تو یہ مٹی

ہم نے البرہان کے پچھلے دو شماروں میں مسلمان بلاگرز کی طرف سے سوشل میڈیا میں توہین خدا و رسول و قرآن پر حکمرانوں کے ساتھ دینی قوتوں اور عوام کی خاموشی اور بے حسی پر رنج و قلق کا اظہار کیا تھا اور مارچ کے شمارے میں درخواست کی تھی کہ ہر شہر سے پچاس لوگ ان دریدہ دہنوں کے خلاف مقدمہ درج کرائیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہماری نحیف آواز کہاں تک پہنچی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام کر دیا۔ ایک صاحب اسلام آباد ہائی کورٹ چلے گئے اور کیس ایک ایسے جج نے سنا جو دینی حمیت اور غیرت رکھتا تھا۔ جسٹس شوکت عزیز صدیقی صاحب کی جرأت ایمانی نے پانسہ پلٹ دیا اور انہوں نے انتظامیہ (بیوروکریسی اور سیاسی حکمرانوں) کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ ان کے بیانات (Observations) اور فیصلوں نے کفر و نفاق کے علمبرداروں کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا اور عوام اور دینی حلقوں کی طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہو رہے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسٹس صاحب کا اقبال بلند فرمائے اور انہیں حاسدوں کے حسد اور شریروں کے شر سے محفوظ رکھے (آمین، یاربّ العالمین)۔ اس واقعہ سے سبق سیکھنے اور عبرت پکڑنے کی کئی جہات ہیں جن پر تدبر و تفکر ضروری ہے۔

ایک: دینی لوگوں کا یہ رویہ غلط ہے کہ وہ اہل کفر و نفاق کی چلت پھرت، خوش حالی اور غلبے سے مرعوب ہو کر یا تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور دب جاتے ہیں یا مزاحمت و کوشش ترک کر کے کفر و نفاق کے ساتھ مصالحت و مفاہمت (Compromise) پر اتر آتے ہیں۔ یہ دونوں صحیح رویے اور ردِ عمل نہیں ہیں۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں ہر سپاہی اہم ہوتا ہے۔ ہر شخص کو کھڑے رہنا چاہیے، مزاحمت کرنی چاہیے اور آخر وقت تک لڑنا چاہیے۔ ایک آدمی کے کھڑے رہنے سے اور اسے دیکھ کر سیکڑوں کی ہمت بندھتی ہے اور وہ بھی باطل کی مزاحمت پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا خود کو کمزور سمجھیے نہ تنہا اور نہ کمپرومائز کیجیے۔ افسوس! لوگوں کا فارسی کا ذوق کمزور ہو گیا ہے

ورنہ وہ اقبال کی اس رباعی سے لطف اندوز ہوتے جو جدوجہد اور باطل سے آویزش پر ابھارتی ہے ۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

یعنی زندگی ساحل سے اٹھکھیلیاں کرتی لہروں سے لطف اندوز ہونے کا نام نہیں۔ حیاتِ جاوداں سمندر میں کودنے اور لہروں سے لڑنے سے حاصل ہوتی ہے۔

دوم: زندگی کے اہم شعبوں خصوصاً عدلیہ میں یقیناً ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلامی تعلیمات کی حقانیت پر شعوری اعتماد رکھنے کی بجائے مغربی فکر وتہذیب اور اس کے علوم ومعارف اور اقدار وروایات سے مرعوب ومتاثر ہیں اور وہ فیصلے کرتے وقت اسلام کے نظام عدل اور اس کی روایات کو سامنے رکھنے کی بجائے زمانے کے چلن اور حکومتوں کے دباؤ اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہیں ... بلکہ اگر اسلامی تقاضے سامنے رکھے جائیں تو وہ اس قابل ہی نہیں کہ انہیں اعلی عدلیہ کا جج مقرر کیا جائے۔

اس کی ذمہ دار ہماری ریاست واسٹیبلشمنٹ تو ہے ہی جس نے قیام پاکستان کے بعد معاشرے اور خصوصاً نظام تعلیم وتربیت کی اسلامی تشکیل نو کی بنیادی ذمہ داری کی طرف توجہ نہیں دی ....لیکن ہمارے دینی حلقے اور علماء کرام بھی اس کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے پرائیویٹ سیکٹر میں جہاں انہیں کام کرنے کی کھلی آزادی تھی (اور اس آزادی سے فائدہ اٹھا کر مغرب زدہ اور پیسہ کمانے والے لوگوں نے مغرب کی الحادی فکر وتہذیب سے موافقت رکھنے والے اور اسے فروغ دینے والے ہزاروں تعلیمی ادارے قائم کر دیے ہیں) لیکن انہوں نے ایسے تعلیمی ادارے قائم نہیں کیے جو اسلامی تناظر میں ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتے کہ اس سے فارغ ہونے والے افراد معاشرے اور ریاست کو اسلامی خطوط پر چلاتے۔ کیا دینی جماعتوں، اداروں اور افراد نے کوئی ایک لاء کالج بھی ایسا بنایا ہے جس میں مغربی قانون کے ساتھ شریعت کا قانون بھی پڑھایا جاتا ہو اور جس کے لاء گریجوایٹس کی اسلامی تربیت بھی کی جاتی ہو؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں

ہے تو ہم کس کو دوش دیں؟

جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے تو وہ آج بھی مساجد کے لیے امام و خطیب اور مدارس کے لیے معلم تیار کرنے کے ہدف سے آگے نہیں سوچ رہے۔ وہ آج بھی اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ وہ معاشرے اور ریاست کو چلانے کے لیے لائق اور متدین کارکن تیار کریں اس طرح انہوں نے اپنی خام عقلی سے معاشرے اور ریاست کو خود سیکولر اور لبرل لوگوں کے حوالے کر رکھا ہے۔

اس پسِ منظر میں اگر کسی ادارے سے یا عدلیہ کے کسی فرد کے طرز عمل سے خوشبو کا تازہ جھونکا آتا ہے تو اسے اللہ کی دین سمجھنا چاہیے اور والدین کی تربیت یا ذاتی کوششوں کا نتیجہ، نہ کہ سسٹم کی پیداوار.... خواہ جدید تعلیم ہو یا دینی مدارس، کہ وہ تو کاٹھے بیر ہی پیدا کر رہے ہیں نہ کہ میٹھا اور خوشبو دار پھل۔

سوم: ملک میں مغرب زدہ سیکولر اور لبرل لوگوں، دانشوروں اور وکلا کی کمی نہیں لہٰذا ایک طبقہ جسٹس صدیقی صاحب کے طرز عمل کو ملائیت اور مولویت سے تعبیر کر رہا ہے اور ان کی شدید مخالفت کر رہا ہے۔ (حالانکہ جسٹس صاحب نے جو کچھ کیا ہے آئین کے مطابق کیا ہے اور وہ کھرے پروفیشنل ہیں) ان لوگوں کی ایک سپہ سالار عاصمہ جہانگیر ہیں۔ ہم لوگوں کے حافظے کمزور ہیں اور ہم جلد حقائق کو بھول جاتے ہیں۔ قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک میں توہین رسالت کا قانون بنا ہی عاصمہ جہانگیر کے توہین رسالت کرنے کی وجہ سے تھا۔ آپ اسماعیل قریشی صاحب کی اردو [اور انگریزی] تصنیف ''ناموسِ رسول ﷺ اور قانونِ توہین رسالت'' اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ایک تقریب میں عاصمہ جہانگیر نے اپنی تقریر میں گستاخئ رسول کی، ہنگامہ ہو گیا، تو انہیں خیال آیا کہ توہین رسالت کا قانون بننا چاہیے۔ انہوں نے اس پر کام شروع کیا، قانون کا مسودہ بنایا، معاملہ شرعی عدالت اور پارلیمنٹ میں گیا اور انہوں نے عمر بھر اس قانون کو منظور اور نافذ کرانے کی جدوجہد کی۔ اور ہماری دینی قوتوں کی کم عقلی اور کم ظرفی دیکھیے اور نیرنگئ زمانہ بلکہ دین مخالف قوتوں کی پلاننگ اور حکمت عملی دیکھیے کہ اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ کو آج کوئی جانتا ہی نہیں اور گستاخ رسول عاصمہ جہانگیر آج بھی دندناتی پھر رہی ہے، وکلاء کی لیڈر ہے اور نواز شریف جیسے حبّ جاہ و مال کے رسیا حکمران، جن کے پیشِ نظر صرف اقتدار

اور مال ہے اور ن لیگی حکومت جیسی مغرب زدہ حکومتیں ان کی وکیلا نہ قوت کے آگے سر جھکائے رہتی ہیں اور اسلام، دوقومی نظریے اور مملکتِ خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سیکولر اور لبرل قوتوں کی وہ سپہ سالار بنی ہوئی ہے اور کوئی اسے پوچھنے ٹوکنے والا نہیں۔ حکومت تو رہی ایک طرف خود دینی لوگوں میں سے بھی کوئی نہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار.

چہارم: سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ توہین رسالت کے حوالے سے آئین کی جو تشریح جسٹس صدیقی صاحب نے کی ہے وہ کیوں اس سے مختلف ہے جو ممتاز قادری کیس میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں نے کی تھی؟ اس کا جو جواب ہمیں سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ آئین کی اسلامی شقیں دونوں طرح کے جج صاحبان کے سامنے یکساں تھیں لیکن ممتاز قادریؒ کیس میں جج صاحبان کسی وجہ سے آئین کی ایسی تشریح نہ کر سکے جو آئین کا تقاضا تھی اور جو اسلامی حمیت وغیرت کا تقاضا تھی۔ حالانکہ سپریم کورٹ کے ججوں نے تسلیم کیا تھا کہ وہ شرعی امور میں مہارت نہیں رکھتے .... لیکن اس کے باوجود انہوں نے انتہائی نازک اور حساس شرعی معاملے میں فیصلہ دیا اور غلط فیصلہ دیا۔ جسٹس صدیقی صاحب بھی کسی دینی مدرسے سے فارغ اور عالم دین نہیں ہیں لیکن ان کا مائنڈ سیٹ بہر حال ممتاز قادریؒ کیس کے ججوں سے مختلف ہے اور اسی وجہ سے رائے عامہ جسٹس صدیقی صاحب کے فیصلے کی تحسین کرتی اور ممتاز قادریؒ کیس کے ججوں پر تنقید کرتی اور ان کی وجہ سے عدلیہ کو سیکولر اور لبرل قرار دیتی ہے۔

لیکچر سیریز

مطالعۂ مغربی فکر و تہذیب

مربی: جناب احمد جاوید صاحب

تاریخ: ہر انگریزی مہینے کی پہلی اور تیسری جمعرات

مقام: ادارہ تعلیم و تحقیق (IER) جامعہ پنجاب (نیا سیمینار ہال)

وقت: نماز مغرب کے فوراً بعد (نماز مغرب انسٹی ٹیوٹ میں ادا کریں)

نوٹ: پہلا لیکچر ۶/اپریل ۲۰۱۷ء کو ہوگا، ان شاء اللہ

تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ بتعاون ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب

تعلیم و تربیت ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

دینی تعلیم کی موجودہ صورتِ حال

اور مسلم برصغیر کی دینی تعلیم کی تاریخ کا مختصر جائزہ (آخری قسط)

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ موجودہ دینی مدارس صرف پہلے دو اہداف کو پورا کر سکتے ہیں۔ ان کے فضلاء کسی حد تک امامت وخطابت یا پھر مختلف مدارس میں تدریس کی ذمے داریاں بجالا سکتے ہیں۔ اگرچہ میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مدرسہ کے فاضل کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، ایک اچھا امام بننے کے لیے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کراچی، اسلام آباد، لاہور، ڈھاکہ، چاٹ گانگ، دہلی یا بمبئی میں نمازیں پڑھانے والے کو میبذی، ہدایت الحکمت یا شرح ہدایت الحکمت پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اسے شرح جامی کی بال کی کھال اتارنے والی شروحات اور حواشی کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہمارے برصغیر اور خاص طور پر صوبہ سرحد (حال خیبر پختون خواہ) میں اس کی شروحات اور شروحات کی شروحات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ایک طالب علم کافیہ پڑھتا ہے جو عربی نحو کا ایک متن ہے، لیکن یہ پڑھنے والوں کو کبھی نحو نہیں آتی۔ مجھ سے لکھ کر لے لیجیے، ان میں سے ننانوے فیصد ایسے ہیں جن کو درست عربی کا ایک جملہ بھی لکھنا نہیں آتا۔ وہ درست عربی کا ایک جملہ بھی درست بول نہیں سکتے۔ کافیہ کے ذریعے حاصل کیے گئے ان کے نحوی ''کمال'' کا یہ عالم ہے۔ اس کا طرزِ تدریس یہ ہے کہ اس کی پہلی سطر پر دو تین ہفتے بحث ہوتی ہے جس کا نحو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کافیہ کا مصنف بے چارہ اس کے شروع میں بسم اللہ یا الحمد للہ نہیں لکھ سکا، اس لیے پہلا سوال ہی یہ قائم کیا جاتا ہے کہ مصنف نے بسم اللہ کیوں نہیں لکھی؟ اب یہاں علمائے کرام خیالی گھوڑے دوڑانے اور قیاسات قائم کرنے لگتے ہیں کہ اس کی یہ یہ وجہ ہوسکتی ہے۔ بال کی کھال اتاری جاتی ہے جس کا عربی نحو سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا اور اس سطح پر طالب علم بیچارے کی کوئی استعداد نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ شرح جامی شروع کرتا ہے جو کافیہ کی شرح ہے۔ شرح جامی کا ایک حاشیہ ہے جس کا نام تحریر سنبٹ ہے اور پھر اس کا حاشیہ سوالِ کابلی ہے۔ سوالِ کابلی پر ایک حاشیہ، سوالِ باسولی ہے۔ یہ سب کچھ صوبہ سرحد میں پڑھایا جاتا ہے اور باوجود اس کے کہ دس برس تک یہ کچھ پڑھایا جاتا ہے، یہ سب پڑھنے والے عربی کا ایک جملہ لکھنے کے اہل بھی نہیں ہوتے۔ پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر اس کا کچھ فائدہ ہے بھی تو مجھے اس سے انکار نہیں لیکن

ایک امام کو ان چیزوں کی کیا ضرورت؟ ان کے مقتدی ان سے یہ سوالات نہیں پوچھیں گے۔ یہ امام اور مدرسے دونوں کے لیے وقت کا ضیاع ہے۔ مستقبل کے متوقع امام کو تیار کرنے کے لیے ان مضامین کی تدریس وسائل کا ضیاع ہے جن کی اسے کبھی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس کے مقابلے میں اس کو روزمرہ زندگی کے مسائل جاننے کی ضرورت ہے۔ لوگ اس سے بینک کے سود کے بارے میں سوال کریں گے۔ لوگ اس سے انگلینڈ میں رہن کے بارے میں پوچھیں گے۔ وہ اس سے لیزنگ اور شیئرز کی خرو فروخت کے بارے میں دریافت کریں گے۔ امام بے چارہ ان سوالوں کو جواب نہیں دے سکتا، کیوں کہ اسے یہ چیزیں پڑھائی ہی نہیں گئیں۔

اس لیے میرا احساس یہ ہے کہ ایک امام کے لیے درس نظامی کافی نہیں ہے۔ اس میں ترمیم اور تبدیلی اور اضافوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک درسِ نظامی کے اساتذہ یا اس کی کتابیں پڑھانے والوں کا تعلق ہے تو وہ سارے یا کم از کم بعض یہ نصاب پڑھانے کے اہل اور موزوں ہیں، لیکن اولیول یا اے لیول کے بچوں کو پڑھانے کے لیے مدرسوں کے پڑھے ہوئے لوگ بہ مشکل ہی اہل ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ اضافی تقاضے پورا کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے اندر اسلامی بینکنگ رواج پا چکی ہے اور اس سے متعلق احکام جاننے کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے پاکستان میں اسلامی طرز کے مطابق بنکاری کی خواہش رکھنے والے بنکوں کے لیے ایک قانونی فریم ورک قائم کیا ہے، تاکہ شریعت سے مطابقت رکھنے والے موڈز کو پروان چڑھایا جاسکے۔ اسٹیٹ بنک کا یہ مطالبہ ہے کہ جو بنک یا تمویلی ادارہ شریعت سے مطابقت رکھنے والے موڈز اور آلات کا خواہش مند ہے، اس میں ایک شریعہ ایڈوائزر ہونا چاہیے۔ ملکی سطح پر انہوں نے ایک شریعہ بورڈ قائم کیا ہے، جس نے دوسرے بنکوں میں لاگو کرنے کے لیے اصول اور پالیسیاں وضع کی ہیں۔ اس کے پاس اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی اتھارٹی ہے اور تمام بنکوں سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک شریعہ ایڈوائزر کا تقرر کریں، جو بنک کی معاونت کے ساتھ اس بات کی یقین دہانی کرائے کہ بنک کی مصنوعات اور معاملات شریعت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔

ہم نے شروع میں یہ طے کیا تھا کہ شریعہ ایڈوائزر درس نظامی اور مدرسے کا فاضل ہونے کے ساتھ انگریزی اور بنکنگ کا علم بھی رکھتا ہو۔ تین مہینے کے بعد بنکوں نے یہ شکایت کی کہ ہمیں کوئی ایک بھی (اور اس بات کو میں تاکید سے کہتا ہوں) آدمی ایسا نہیں ملا جو درس نظامی کا فاضل

ہونے کے ساتھ انگریزی اور بنکنگ کے مسائل کا علم بھی رکھتا ہو۔ یہ لوگ بورڈ کے پاس آئے کہ اس ضابطے پر نظر ثانی کی جائے اور اب بورڈ اس ضابطے پر نظر ثانی کر رہا ہے تاکہ اس مہارت کے افراد دستیاب ہوسکیں جو بنکوں کے لیے کارآمد ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درسِ نظامی کے فضلا ان کے موجودہ نظام کے لیے زیادہ اہل نہیں ہیں۔ ان کے پاس اداروں اور حکومت، نیز قوانین واداروں کے اسلامیانے کے عمل سے وابستہ باڈیز کو رہنمائی فراہم کرنے کے لیے مناسب افراد نہیں ہیں۔ بنگلہ دیش میں ایک بڑا اسلامی بنک کام کر رہا ہے اور یہ اسلامی بنک جدید دنیا کا ایک کامیاب اسلامی بنک ہے۔ اگر اسے دینی محققین کی ایک جماعت کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ بینک مدارس سے یہ مطالبہ کرتا ہے تو میرا خیال نہیں ہے کہ روایتی مدارس کوئی ایسی ماہرانہ کھیپ اسے مہیا کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

اس کے بعد ان بڑے چیلنجز کا نمبر آتا ہے جو اس وقت مسلمان امت کو درپیش ہیں۔ تقریباً دس سال پہلے ہنٹنگٹن نے ایک کتاب ’’تہذیبوں کا تصادم‘‘ کے نام سے تحریر کی تھی۔ فرض کیجیے کہ ایک دینی عالم سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کتاب کا جواب تحریر کرے تو برصغیر میں کراچی سے راس کماری تک یا خیبر سے چاٹ گانگ تک، درسِ نظامی کے کتنے فضلا یا کوئی ایک ہی فاضل ہے جو اس کتاب کا جواب تحریر کر سکے؟ میرا خدشہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ہے کہ ہماری دینی تعلیم پر نظر ثانی اور تشکیل نو ہونی چاہیے، تاکہ مندرجہ ذیل پانچ میدانوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس میٹرک کے بعد ایک اچھا امام تیار کرنے کے لیے دو، تین یا چار سالہ کورس ہونا چاہیے۔ اگر کسی کے پاس سکولوں سے میٹرک کی سند ہے، وہ حافظ اور قاری بھی ہے، تو اسے تین سالوں میں عربی اور قرآن کا متن مع ترجمہ بھی پڑھا دیا جائے۔ اس کے ساتھ دو یا تین تفاسیر، ایک اردو یا بنگالی زبان میں اور ایک عربی میں، منتخب احادیث (مثلاً مولانا منظور نعمانی کی ’’معارف الحدیث‘‘ یا مولانا بدر عالم میرٹھی کی ’’ترجمان السنۃ‘‘) اور ایک عربی مجموعۂ حدیث جیسے مشکوۃ، دوتین اصولِ فقہ اور فقہ کی منتخب اچھی کتابیں جیسے قدیم کتابوں میں سے ’’ہدایہ‘‘ اور جدید کتابوں میں سے ʃhħø'D' š(ǫø̈nṭ Ţǘ` جدید معاشی، قانونی اور فقہی مسائل اور حکومتی ودستوری اور بین الاقوامی قانون وغیرہ امور سے متعلق کچھ کتابیں پڑھا دی جائیں۔ اس طرح ایک امام اس قابل ہوسکے گا کہ وہ مختلف پوچھے گئے مسائل کا جواب دے

سکے۔ یہ نصاب میٹرک کے بعد تین سالوں میں پڑھایا جاسکتا ہے۔

تین سال کی اس بنیادی دینی تعلیم کے بعد، جو انٹرمیڈیٹ یا اے لیول کے برابر ہے، دو تین یا چار سالہ ایک دوسرا کورس ان لوگوں کے لیے ہونا چاہیے جو سکولوں اور کالجوں میں ذمے داریاں ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کورس میں کچھ اضافی مضامین کے ساتھ مسلم امت کو پیش آمدہ موجودہ مسائل کے حوالے سے تعلیم بھی ہونی چاہیے۔

اس کے بعد موجودہ درسِ نظامی کا درجہ آتا ہے جو ان لوگوں کو پڑھانا چاہیے جو ان مدارس میں تدریس کرنا چاہتے ہیں تاہم اس میں بھی ترمیم ناگزیر ہے۔

صَرف ونحو وغیرہ کی کچھ غیرضروری اور غیر مؤثر کتابیں نکال کر ان کی جگہ نئی کتابیں شامل کی جاسکتی ہیں اور اس کے علاوہ قدیم معقولات پر زیادہ زور دینے کے بجائے کچھ کتابیں نئے فلاسفہ اور جدید مغربی فکر کے حوالے سے شامل کرنا ضروری ہیں۔ عربی اور اردو میں ایسی اچھی کتابیں موجود ہیں جن میں مغربی فکر کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کی کتابیں مستقبل کے مدارس کے اساتذہ کو پڑھانا ضروری ہیں تاکہ انہیں یہ احساس ہو سکے کہ وہ کس دنیا میں جی رہے ہیں اور امت مسلمہ کو آج کیا چیلنجز درپیش ہیں۔

پھر ہمیں امت کی عالمی سطح کی قیادت کی ذمے داری سنبھالنے، اداروں اور قانون کی تشکیل نو اور امت کے مستقبل کے لیے نئے نظام وضع کرنے کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا اسلامی نصاب درکار ہوگا۔

میری ناچیز رائے میں یہ اسلامی تعلیم کی مستقبل کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی سے دنیا کے مختلف حصوں میں امت مسلمہ میں حال اور مستقبل کے حوالے سے ایک آگاہی اور شعور ابھر رہا ہے۔ روایتی علما، جدید تعلیم یافتہ شخصیات اور دونوں روایات کو جمع کرنے والے حضرات نے بڑی تعداد میں ادارے قائم کیے ہیں۔ مَیں بنگلہ دیش کے دو اداروں کی مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ چٹا گانگ میں قائم بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی جس کا مقصد دینی تعلیم کو جدید علم کے ساتھ مربوط کرنا اور ایسے مسلمان محققین تیار کرنا ہے جو معتدل رجحان کے حامل ہوں اور دین کے گہرے علم کے ساتھ اعلیٰ عصری فہم رکھتے ہوں۔ دوسرا ادارہ دارالاحسان یونیورسٹی ہے، جسے بیسویں صدی کے نامور اسلامی فلسفی مرحوم پروفیسر سید علی اشرف نے قائم کیا تھا۔ وہ مسلم امت کے مستقبل کی

ضروریات کے حوالے سے بڑا شفاف موقف رکھتے تھے اور ان ہی کے افکار کی روشنی میں یہ یونیورسٹی وجود پذیر ہوئی۔ ان دواداروں کے علاوہ علما کے قائم کو وہ نسبتاً چھوٹے ادارے بھی ہیں۔ مجھے بھی اس طرح کے ایک ادارے میں ایک بار جانے کا موقع ملا جہاں مدارس کے فضلا کو تین یا چار سال کے ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ ان کو تخصص کی سطح پر فقہ (جدید قانون کے تقابل کے ساتھ) حدیث (جدید چیزوں کے ساتھ مربوط کر کے) وغیرہ علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ بات خود علما کی طرف سے اس بات کا اعتراف ہے کہ ایک مسلمان عالم کو جدید وسائل اور دست رس کے ساتھ مسلح ہونے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی بھی اس کی ایک مثال ہے، جس میں ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو چٹا گانگ اور ڈھاکہ کے مذکورہ بالا دواداروں کے سامنے ہیں۔ ملیشیا، مصر اور دیگر کئی ممالک میں اس طرح کے ادارے وجود میں آرہے ہیں، لیکن وقت بہت کم ہے اور افسوس ہے کہ علما بہت سست روی کے ساتھ اس طرح کے امور کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ انہیں اس کام کی شدید اہمیت اور امت کو درپیش چیلنج کا احساس کرنا چاہیے۔ اگر وہ نئے پیراڈائم میں اپنے آپ کو منتقل کرنے میں سستی کریں گے تو وقت کا چکر انہیں خود ہی دھکیل کر پیچھے ڈال دے گا۔

تغیرات اور چیلنج بہت بڑے ہیں۔ چیلنج اور خطرے کی سنگینی پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ ہر کوئی اس سے آگاہ ہے۔ میں اپنی بات کا اختتام علما کو خطاب کرتے ہوئے، ایک فارسی شاعر کے شعر پر کروں گا (معذرت خواہ ہوں اگر آپ میں سے کوئی فارسی دان نہیں ہے)۔

رفتم کہ خار از پاک کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

شاعر اس کیفیت کو بیان کر رہا ہے جب کہ وہ محبوب کے قافلے کے ہم رکاب ہے۔ محبوب کی سواری لے جائی جا چکی ہے، ناقہ پیچھے ہے اور عاشق بے چارہ برہنہ پا ہے اور اسی کیفیت میں ناقے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس صورت حال میں وہ کہتا ہے کہ میرے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا اور میں ایک لمحے کے لیے کانٹا نکالنے رکا کہ اسی اثنا میں کارواں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

لمحوں کی خطا کی تھی، برسوں کی سزا پائی

اس لیے اگر ہم نے اپنی ذمے داری سے ایک لمحے کے لیے بھی تغافل برتا تو پھر قافلہ ہم سے سو سال کی مسافت کی دوری پر چلا جائے گی۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

بچیوں کی تعلیم .... چند غور طلب پہلو

❁ وزیر اعلیٰ پنجاب نے یہ اچھا اقدام کیا ہے کہ بچیوں کی تعلیم کے لیے وظیفہ کا اعلان کرایا ہے لیکن اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ والدین اپنی بچیوں کو سکولوں کالجوں میں کیوں نہیں بھجواتے اور دیہی علاقوں میں اور خصوصاً بلوچستان، خیبر پختون خواہ اور جنوبی پنجاب میں بچیوں کی شرح تعلیم کم کیوں ہے؟ ہمارے تجزیے کے مطابق والدین اس لیے اپنی بچیوں کو سکول کالج بھجوانا پسند نہیں کرتے کہ ہمارا نظام تعلیم مغرب زدہ ہے، اس میں بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت کا موثر انتظام موجود نہیں اور مروجہ جدید تعلیم کے نتیجے میں بچیاں اسلامی اقدار کی مخالف ہو جاتی ہیں اور ماڈرن بن کر اپنی من مانی کرنے پر اتر آتی ہیں۔ اس لیے والدین کہتے ہیں کہ ہم ایسی تعلیم کے بغیر ہی بھلے۔

دوسری طرف دینی مدارس کی تعلیم ہے جو قرآن و حدیث کا محدود تصور دیتی ہے اور اس طرح کا فرد تیار ہی نہیں کرتی جو آج کے معاشرے میں کھپ اور پنپ سکے تو والدین بیچارے کدھر جائیں؟ جب تعلیم پرائیویٹائز ہوئی تھی تو اس وقت توقع تھی کہ دینی افراد اور دینی جماعتوں کے لوگ تعلیم صحیح دینی تناظر میں دیں گے لیکن وہ بھی تعلیمی ثنویت سے باہر نہیں نکل سکے۔ دنیا اور پیسے کی محبت نے انہیں جدید مغرب زدہ نظام تعلیم کو اپنانے اور جاری رکھنے پر راغب کر دیا یا غیر موزوں مذہبی تعلیم کے خول سے نکلنے نہیں دیا۔ ایک عام آدمی کہاں جائے؟

❁ ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے۔ کالجوں یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے بڑھ رہی ہے بلکہ بڑھ چکی ہے اور کئی پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں میں تو لڑکوں کے لیے کوٹہ رکھنا پڑتا ہے ورنہ میرٹ پر سو فیصد لڑکیاں آ جاتی ہیں کیونکہ وہ لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ محنتی، یکسو اور لائق ہوتی ہیں۔ لیکن ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی وجہ سے معاشرے میں اخلاقی اور معاشرتی مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں اور مستقبل میں وہ زیادہ شدید ہوتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً لڑکیاں زیادہ پڑھ جاتی ہیں اور نوکری کرنے لگتی ہیں تو ان کی شادی مشکل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے سے کم پڑھے لکھے لڑکے سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۰)

تعلیم و تربیت

پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق عجمی[۱]

علوم کی اسلامی تشکیلِ نو

علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کے افکار کا تقابلی مطالعہ

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو برطانوی تسلط کے دوران میں اور آزادی کے بعد جن مسلم زعماء نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے پرخلوص اور بامعنی مساعی سرانجام دیں ان میں خاص طور پر سرسید احمد خان، علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔

سرسید کو جس چیلنج کا سامنا تھا، وہ اس لحاظ سے بہت کٹھن اور مشکل تھا کہ اقتدار اور وقار سے محروم مسلم قومیت کو نئی حقیقتوں کی قبولیت کے لیے تیار کرنا اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے کردار کو ڈھالنے کا تھا۔ جبکہ اقبال کا اصل کارنامہ ہے کہ انہوں نے مغرب کے استعماری کردار اور افکار سے مرعوب ہوئے بغیر اسلامی فکر کی حقیقی روح کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے فکر اقبال کی توسیع کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے اسلام کو ایک ایسے نصب العین کے طور پر پیش کیا جس سے انسانیت کے مستقبل کو وابستہ کیا جا سکتا ہے۔

سرسید کی پوری زندگی، ان کی تصانیف و تالیفات اور قومی مہمات پر نظر ڈالی جائے تو دو غالب رجحانات: جستجوئے علم اور اصلاحِ قوم کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان کی قومی خدمات کا دائرہ وسیع ہے جو ادبی، مذہبی اور تعلیمی شعبوں کو محیط ہے لیکن ان کی تعلیمی مساعی کا پلڑا اس لیے بھاری ہے کہ ان کے موقف کے مطابق تعلیمی میدان میں ترقی کے بغیر قوم کسی شعبے میں بھی پیش رفت کے قابل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا سائنٹفک سوسائٹی کے قیام (۱۸۶۴ء) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۸۶۶ء) اور تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰ء) کے اجرا اور مدرسۃ العلوم (ایم۔اے۔او۔کالج) علی گڑھ کے قیام (۱۸۷۰ء) اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس (۱۸۸۶ء) کو اس مقصد کے حصول کے لیے کی جانے والی کوششوں سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

سرسید کی جدوجہد کا مقصد عظیم تھا، راستہ دشوار اور مخالفت بے پناہ تھی۔ خاص طور پر ان کے مذہبی خیالات، جنہیں روایتی ذہن آج بھی قبول کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتا، ان کے تعلیمی

---

[۱] جی سی یونیورسٹی لاہور۔ یہ بحث پروفیسر صاحب کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا ایک جزء ہے۔

خیالات اور خدمات پر بھی شدید اعتراضات کیے گئے اور ان کی ایک تعلیمی رہنما کی حیثیت کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا۔

حالانکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آج برصغیر پاک وہند میں تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر ترقی یافتہ مسلم خاندانوں اور برادریوں کی اکثریت سرسید ہی کے افکار سے حاصل ہونے والی روشنی کے طفیل پسماندہ طبقات میں شامل ہونے سے محفوظ ہے۔(۱)

سرسید نے اپنے دورۂ انگلستان (۱۸۶۹ء) کے دوران کیمبرج اور آکسفورڈ کا گہرا جائزہ لیا اور پھر وطن واپس آکر انہی کی طرز پر علی گڑھ میں کالج قائم کیا جہاں سے حریت اور روشن خیالی کے سوتے پھوٹے۔ مخالفین تسلیم نہ کریں لیکن ظفر علی خان، جوہر اور حسرت جیسے فرزند اسی مادر علمی کی فضاؤں میں پروان چڑھے۔ علی گڑھ سے کسب فیض کرنے والوں کی فہرست طویل ہے جس کا تذکرہ سروت پیش نظر نہیں اور پھر سرسید کے اثرات صرف علی گڑھ تک ہی محدود نہ تھے بلکہ وہ پورے ملک میں دور ونزدیک تک پہنچے۔ لہٰذا اقبال کو بھی بالواسطہ سرسید کی تعلیمی تحریک کا ثمرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔(۲)

بعض مستشرقین کی جانب سے اسلام پر سائنس دشمنی کا جو اعتراض وارد کیا جاتا رہا ہے اس کا جواب سرسید اور اقبال کے ہاں یکساں موقف کی صورت میں ملتا ہے جس کا تجزیہ کرتے ہوئے محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ برصغیر میں سرسید اور اقبال دراصل مشاہداتی اور تجرباتی سائنس کے موید ہیں۔ سید نے برصغیر میں مغرب کے اس دعوے کے بطلان کے لیے کہ اسلام سائنس دشمن ہے اسلامی مدارس کے نصاب (Curriculum) میں بنیادی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا تھا، اقبال کے جو خطبات: "Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں وہ بھی سرسید کے اس موقف کی تائید کرتے ہیں کہ عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کو ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے اور جدید علوم معرفت الٰہی میں معاون ثابت ہوں گے نہ کہ اس

---

(۱) ڈاکٹر محمد علی صدیقی، سرسید احمد خان اور جدت پسندی، ارتقاء مطبوعات، کراچی ۲۰۰۲ء، ص: ۸۳

(۲) مقالہ نگار نے سرسید کی جو تحسین وتائید کی ہے ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ نہ صرف سرسید کے مذہبی نظریات غلط تھے، ان کے تعلیمی نظریات بھی مخدوش تھے۔ ان کی تعلیمی فکر سے امت کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔ آج بھی ہمارا نظام تعلیم اگر مغرب زدہ ہے اور سیکولرازم و لبرل ازم پھیلا رہا ہے تو اس کی وجہ سرسید کی فکر اور علی گڑھ کا رول ماڈل ہوتا ہے۔ مدیر

کے راستے میں مزاحمت پیدا کریں گے۔(۱)

اسی تصور کو ڈاکٹر رفیع الدین کے تعلیمی افکار کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے کہ مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ تمام سائنس علوم کی بنیاد ہے۔ مشاہدۂ قدرت کے لیے دنیا میں سب سے پہلی اور مؤثر آواز قرآن حکیم نے بلند کی جس نے مظاہر فطرت کو آیات الٰہی یعنی خدا کی نشانیاں قرار دیا جن کے مشاہدے سے خالق کائنات کو جاننا اور اس تک پہنچنا ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں سائنسی طریق تحقیق اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھنے والے سائنس دان مسلمان تھے، جن کی خدمات کا اعتراف مغربی سکالرز، بریفالٹ نے (Making of the Humanity) میں جارج سارٹن نے (An Introduction to the History of Science) اور دیگر مستشرقین نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کا دعویٰ ہے کہ یورپ میں ریاست اور کلیسا کے افتراق کے نتیجے میں سائنس سے خدا کو خارج کر دیا گیا اور اس طرح سے بے خدا سائنس کا ظہور ہوا جو علمی تاریخ کا ایک غیر معمولی سانحہ ہے۔ اقبال کی رہنمائی میں، ڈاکٹر رفیع الدین کی تمام تر فکری کاوشوں کا حاصل یہی نکتہ ہے کہ مذہب اور سائنس کے الحاق کے لیے علوم جدید کی اسلامی تشکیل وقت کا اہم تقاضا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض طبیعتیں اقبال کو معروف معنوں میں ماہر تعلیم تسلیم کرنے میں مانع ہوں لیکن انہوں نے نہ صرف مشرق ومغرب کی اعلیٰ درسگاہوں میں قانون اور فلسفے میں ڈگریاں حاصل کیں بلکہ حصول تعلیم کے بعد اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مستقل بنیادوں پر نہ سہی، لیکن مختصر وقفوں کے لیے درس وتدریس سے وابستگی اختیار کی۔ وہ۔ ایم۔ اے کے بعد ۱۸۹۹ء میں تقریباً چار سالوں کے لیے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربیک ریڈر کی حیثیت سے متعین رہے۔ اس دوران میں چھ ماہ کی رخصت لے کر، اپنی مادر علمی، گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفہ پر درس دیتے رہے۔

اورینٹل کالج کے قیام کے دوران ہی میں انہوں نے اسٹبس کی ''ارلی پلانجٹس'' اور واکر کی ''پولیٹکل اکانومی'' کے ترجمہ وتلخیص کے علاوہ ''علم الاقتصاد'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس سے اقبال کی اقتصادیات کے ساتھ علمی اور نصابی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ کتاب کے مندرجات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اقبال انسانی زندگی میں معاشی پہلو کو کس قدر

(۱) ایضاً

اہمیت دیتے ہیں۔

۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک یعنی حصول تعلیم کے لیے یورپ رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ کی حیثیت سے فرائض بھی سرانجام دیے ہیں۔ انگلستان کے قیام کے دوران میں انہوں نے چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں عارضی طور پر عربی کا درس دیا۔

درس وتدریس کے علاوہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے لیے مڈل اور میٹرک کی سطح کے لیے اُردو/ فارسی نصاب بھی مرتب کیا۔مختلف درجوں کے امتحانات میں ممتحن بھی مقرر ہوتے رہے۔اور ینٹل فیکلٹی اور بورڈ آف سٹڈیز (عربی وفارسی) کے ساتھ بھی تادیر وابستہ رہے۔[۱]

۱۹۳۳ء میں والئی افغانستان، نادرشاہ نے اپنے ملک میں تعلیمی اصلاحات اور ترقی کے لیے، اقبال، سرراس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو دورۂ افغانستان کی دعوت دی۔ اس ضمن میں اقبال نے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر ایک تعلیمی خاکہ تیار کیا اور شاہ کو گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

اقبال کی شخصیت کے تعلیمی اور تدریسی پہلوؤں سے اس حقیقت کا کسی قدر اندازہ ہوجاتا ہے کہ باوجودیکہ انہوں نے درس وتدریس کو مستقل طور پر اپنایا نہیں لیکن اس کے ساتھ ان کی گہری وابستگی (Commitment) کا اظہار یقینی طور پر ہوجاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے فلسفہ تعلیم پر کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی لیکن ان کے شعری ونثری افکار میں فلسفہ وحکمتِ تعلیم کے بارے میں ایسے بلیغ اشارات موجود ہیں جن کو اساس بنا کر ایک تعلیمی نظام فکر مرتب کیا جاسکتا ہے اور اس ضمن میں یقیناً خواجہ غلام السیدین (Iqbal's Educational Philosophy) محمد احمد خان (اقبال اور مسئلہ تعلیم)، ڈاکٹر محمد رفیع الدین (First Principles of

[۱] اقبال کی تعلیمی، تدریسی، نصاب سازی اور یونیورسٹی کے مختلف تعلیمی امور کے ساتھ ان کی وابستگی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے:

۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی تصنیف، اقبال کا ذہنی ارتقا، مکتبۂ خیابان ادب، لاہور ۱۹۷۸ء

۲۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی زندہ رود (جلد اوّل) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۳۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر کے مقالے ''علامہ اقبال اور پنجاب یونیورسٹی'' مشمولہ سہ ماہی ''اردو'' (اپریل، جو ۱۹۸۷ء) ص: ۵ تا ۵۴، انجمن ترقی اردو، کراچی

۴۔ اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مرتبہ انتخاب ''اقبال شناسی اور محور'' بزم اقبال، لاہور ۱۹۸۹ء، میں ان کے اپنے مضمون ''اقبال بحیثیت معلم'' (ص: ۱۲۷ تا ۱۳۷)۔

Education)، بختیار حسین صدیقی (اقبال بحیثیت مفکر تعلیم) اور دیگر مفکرین تعلیم نے قابل قدر کوشش سرانجام دی ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو اپنے دونوں پیش رو مفکرین یا مصلحین پر اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے ایم۔اے کی سطح تک کی تعلیمی تکمیل کے فوراً بعد اپنی خواہش پر درس و تدریس کو اختیار کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے وہ کشمیر میں، جموں، سری نگر اور میر پور کے تعلیمی اداروں میں پروفیسر (عربی و فارسی) اور پرنسپل کے طور پر متعین رہے۔(۱)

آزادی کے بعد پاکستان میں ریسرچ اسکالر کے طور پر مختلف اداروں میں نامور اہل علم کے ساتھ مصروف کار رہے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ پی ایچ ڈی کے بعد پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو فلسفہ تعلیم پر لکھی گئی آپ کی تصنیف ''First Principles of Eduaction'' پر D.Litt کی ڈگری عطا کی گئی۔ اقبال اکادمی پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر کے طور پر بھی جہاں انہوں نے ادارے کی ترقی و استحکام کے لیے اپنا کردار ادا کیا وہیں دیگر موضوعات کے علاوہ تعلیمی موضوعات پر لکھے جانے والے اپنے تحقیقی مقالات کو بھی علمی اجلاسوں میں پیش کیا۔(۲)

اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کی بنیاد رکھی اور اس کے زیر اہتمام ''اسلامک ایجوکیشن'' اور ''اسلامی تعلیم'' جیسے وقیع علمی مجلّات کا اجرا کیا۔ اپنی زندگی کے آخر برسوں میں وہ اپنے فلسفہ تعلیم کی عملی صورت گری کے لیے علوم کی اسلامی تشکیل کے منصوبے پر کام کر رہے تھے اور اس ضمن میں ''The Holy Quran University of Sciences'' کا پیرورک مکمل کر چکے تھے۔ وہ اپنے راستے کی سیاسی و انتظامی رکاوٹوں سے نبرد آزما تھے کہ اچانک دنیا سے ان کے رخصت ہونے کا وقت آ پہنچا اور ان کے وہ منصوبے تکمیل کو نہ پہنچ سکے جن کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے علمی و تحقیقی موضوعات کا دائرہ وسیع ہے لیکن فلسفہ تعلیم کو وہ خصوصی ترجیح دیتے تھے۔ یہ ان کا محبوب موضوع تھا لیکن اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تعلیمی تحقیق ان کے لیے کوئی

---

(۱) تفصیلات ان کی سوانح حیات پر مشتمل باب اوّل میں موجود ہیں۔
(۲) دیکھیے باب اوّل (حصہ تصانیف و تالیفات)

Academic مسئلہ تھا جس پر مسلسل لکھتے چلے جانا ان کی کوئی تصنیفی مجبوری تھی، بلکہ یہ ان کے لیے ایک ایسی اساس تھی جس پر قومی تعمیرِ نو کے عمل کو استوار کیے بغیر نوزائیدہ مملکت خداداد پاکستان کے قیام کے حقیقی مقاصد کا حصول ممکن نہیں تھا۔

فلسفۂ تعلیم پر اپنی مستقل تحقیقی تصنیف ''First Principles of Education'' کے علاوہ، ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنی پہلی تصنیف ''Ideology of the Future'' میں ایک پورا باب Education پر لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اصل تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے اہم مقالات قلم بند کیے۔ ''حکمت اقبال'' میں انہوں نے اقبال کے تعلیمی خیالات کو درج ذیل مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا ہے:

۱۔ خودی اور عقل ۲۔ خودی اور مشاہدۂ قدرت

۳۔ خودی اور سائنس ۴۔ خودی اور علوم مروجہ

آئندہ صفحات میں مذکورہ عنوانات کو زیر بحث لاتے ہوئے کوشش کی جائے گی کہ عصری تعلیمی تناظر میں اقبال اور رفیع الدین کے تعلیمی افکار کا ایک مجموعی جائزہ پیش کیا جا سکے۔

اقبالیاتی تحقیق میں دیگر موضوعات کی طرح اقبال کے تصورِ تعلیم پر بھی بے تحاشا لکھا گیا جس کا حاصل تکرارِ بے جا کر سوا کچھ نہیں۔ اس ضمن میں ایک عام طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ چند زبان زدِ عام اشعار جیسے:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدائے لا الٰہ الا اللہ[۱]

شکایت ہے مجھے یا ربّ خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا[۲]

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف[۳]

---

[۱] کلیاتِ اقبال (اردو) بالِ جبریل، ص: ۳۷۷/ ۵۳

[۲] ایضاً، ص: ۳۶۸/ ۲۴

[۳] کلیاتِ اقبال (اردو، ضربِ کلیم، ص: ۵۹۹/ ۹۹)

اور اسی طرز کے اشعار کو حوالہ بنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اقبال مغربی نظام تعلیم کے زبردست ناقد تھے کہ مسلمانانِ برصغیر کی ذہنی وفکری غلامی اسی نظام تعلیم کا براہِ راست نتیجہ تھی اور پھر دیگر اشعار کی مدد سے ایک نظریہ تعلیم دریافت کیا جاتا ہے جیسے اقبال سے منسوب کر کے اپنے تعلیمی و تحقیقی فرض سے بڑی آسانی کے ساتھ خلاصی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس موقف کے ثبوت میں دو چار یا دس نہیں سیکڑوں کتب اور مقالات مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

اقبالیات کے ایک عالم نے اقبال کو بھی مغربی نظام کا زخم خوردہ قرار دیا ہے۔[۱] شاید اس کی وجہ بھی ان کے نزدیک یہی رہی ہوگی کہ خود اقبال مغربی نظام تعلیم کی پیداوار تھے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ اقبال مغربی تعلیمی عمل سے گزرے تھے اور انہوں نے اس کا گہرا مشاہدہ بھی کیا تھا اسی لیے وہ صحیح معنوں میں اس کے ناقد بھی تھے۔ یہاں ناقد سے صرف معترض یا نکتہ چیں ہی مراد نہیں بلکہ اس نظام تعلیم کے مثبت پہلو بھی ان پر آشکار تھے جس کا وہ بجا طور پر اعتراف کرتے ہیں۔ کیا اس حقیقت کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ وہ برصغیر میں رائج روایتی طریقہ تعلیم سے بھی نامطمئن تھے اور اس کے ثبوت میں ان کے بے شمار اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں انہوں نے مدرسہ وخانقاہ کے ازکار رفتہ طریق تعلیم اور اس کے اثرات پر چوٹ کی ہے۔

اقبال کے اشعار کی مدد سے ان کی تعلیمی موقف کو اخذ کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے کیونکہ ان کی شاعری بھی ان کی فکر کے ایک منبع کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ان کی نثر بالخصوص ان کے مکاتیب، مقالات اور خطبات جیسے اہم سرچشموں سے استفادہ نہ کرنا یا ان کی اہمیت کو نظر انداز کرنا بھی علمی حوالے سے کوئی درست رویہ نہیں۔ اقبال کی مجموعی فکر کی روشنی میں ان کے تعلیمی تصور کی تفہیم اور تشکیل کے مراحل کو درست طور پر طے کیا جاسکتا ہے۔

اقبال ملکی حالات سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ مغربی تسلط اور اس کے اثرات کا گہرا احساس رکھتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز پر نوجوان مسلم طبقے میں مغربی تعلیم کی کشش اگر ایک طرف فاتح قوم کے خوف کو ان کے ذہنوں سے ختم کر رہی تھی، جیسا کہ سید ابوالحسن علی ندوی کا خیال ہے۔[۲] تو دوسری طرف ایک ذہنی مرعوبیت کی فضا بھی پروان چڑھ

---

[۱] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبال، ص: ۸۲

[۲] ایضاً، ص: ۷۰

رہی تھی۔ اگر کچھ لوگوں پر تقلید کا رنگ غالب آ رہا تھا تو دوسری طرف مغربی درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مغرب کے سامراجی کردار کے خلاف ایک ردّعمل بھی پیدا ہو رہا تھا۔ اقبال کا شمار ایسے ہی مدبرین میں ہوتا ہے جنھوں نے وقتی جذبات کا شکار ہوئے بغیر مستقبل کے بارے میں بصیرت کے ساتھ ایک واضح لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ وہ تعلیمی عمل کے مختلف مراحل کا ایک دانشورانہ بصیرت کے ساتھ احاطہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند تھے اور اس کا اظہار ان کی ابتدائی تحریروں میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔

اقبال تعلیم کو ایک فطری عمل سمجھتے ہیں اور روایتی طریق تعلیم سے اتفاق نہیں رکھتے جس کے مطابق بچے کی نشوونما کے مختلف مراحل میں اس کی نفسیاتی فطرت کے خلاف اس کو ایک مخصوص اور مقرر نصاب میں پابند کر کے تبدیل کے عمل سے گزارا جاتا ہے:

''ہمارا پرانا طریقہ تعلیم چونکہ بچوں کے قوائے عقلیہ وواہمہ کے مدارج نمو کو ملحوظ نہیں رکھتا ہے اس واسطے اس کا نتیجہ ان کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوتا ہے۔ ان کے قوائے ذہنیہ برباد ہوجاتے ہیں اور ان کے چہروں پر ذکاوت کی وہ چمک نظر نہیں آتی جو اس بے فکری کی زندگی کے ساتھ مختص ہے۔ بڑی عمر میں یہ تعلیمی نقص اور بھی وضاحت سے دکھائی دیتا ہے۔''[۱]

بچوں کی تعلیم وتربیت پر حد درجہ اصرار کی وجہ یہی ہے کہ ان کے نزدیک تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے اور اگر اس ضمن میں علمی اصولوں کو اساس بنایا جائے گا تو اس کے نتیجے میں بہت سی تمدنی شکایات کا ازخود ازالہ ہوجائے گا۔ کیونکہ اگر بچے کو ابتدا ہی سے ایک ایسی زندگی گزارنے کا درس دیا جائے جو تعصّبات اور توہمات سے پاک ہو اور جس کا تعلق پوری انسانیت کے ساتھ ہو، ایسے کامل انسان کا وجود اسی صورت میں ممکن ہے جب ہر بچے کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ اپنے آپ کو عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔[۲]

ظاہر ہے کہ ابتدائی مدارج میں طالب علم کے اندر اعلیٰ اخلاقی صفات محض لفظوں کے رٹے سے پیدا نہیں کی جاسکتی ہیں بلکہ اقبال کے نزدیک اس کے لیے بچے کے مختلف قویٰ کے ظہور کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اخلاقی تحریکوں سے متحرک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو علمی جذبے سے

---

[۱] سید عبدالواحد معینی (مرتب) مقالات اقبال، آئینۂ ادب، لاہور، باردوم، ۱۹۸۸ء، ص: ۳۳

[۲] سید عبدالواحد معینی (مرتب) مقالات اقبال، آئینۂ ادب، لاہور، باردوم، ۱۹۸۸ء، ص: ۳۳، ۳۴

سرشار معلم کے ذریعے ہی سے ممکن ہے کیونکہ معلم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے اور ہر قسم کے اخلاقی تمدن اور مذہبی نیکیوں کی کلید اس کے ہاتھ میں ہے۔ تعلیمی عمل کے مختلف مدارج میں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان میں امن، محبت اور صلح کاری کی عادات کو واضح کرتا چلا جاتا ہے۔(۱)

تعلیم محض معلومات کا طومار یا انبار اکٹھا کرنا نہیں جسے میکانیکی انداز میں ایک طالب علم کے دماغ میں ٹھونس دیا جائے اور وہ ایک مقررہ مدت کے بعد اسی کچے پکے مواد کو کمرہ امتحان میں Answer Sheet پر اگل کر خود کو سند کے حصول کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ یہ عمل محض معلومات کی منتقلی، یادآوری اور زیادہ سے زیادہ معلومات کو امتحان کے دوران احاطہ تحریر میں لانے سے عبادت ہے اور اس تمام تعلیمی عمل میں علمی مقصود نظر سے اوجھل رہتا ہے، شخصیت یا انفرادیت کی نشوونما کا عمل بھی مفقود ہے جبکہ اقبال کے نزدیک تمام تر تعلیمی عمل، جیسا کہ ماہرین نے اقبال کی مجموعی فکر کی روشنی میں ان کے تصور تعلیم کو اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، وہ یہی ہے کہ قدرت نے انسان کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان کو بیدار کیا جائے تاکہ ان کو اعلیٰ انسانی مقاصد کے لیے آمادہ عمل کیا جا سکے۔(۲)

اسی کو دوسرے الفاظ میں اقبال کے فلسفۂ خودی کا مرکزی نقطہ قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کی روشنی میں اقبال کے دیگر تصورات کی، جن میں ان کا تصور تعلیم بھی شامل ہے، تشریح و تفسیر کی جا سکتی ہے۔ گویا تصور خودی ایک ایسی کلید ہے جس کے وسیلے ہی سے ان کے دیگر تصورات کی تفہیم ممکن ہے۔

اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد مغرب کے مختلف تعلیمی مکاتب فکر اور ان پر اقبال

---

(۱) ایضاً، ص: ۴۱، ۴۲

(۲) اقبال کے تصور تعلیم کے اس پہلو پر خواجہ غلام السیدین نے اپنی تصنیف Iqbal's Educational Philosophy، کے بالخصوص پہلے دو ابواب: ۱۔ The Concept of Individuality ۲۔ The Growth of Individuality میں تفصیلی بحث کی ہے جبکہ محمد احمد خاں کی ضخیم تصنیف ''اقبال اور مسئلہ تعلیم'' کے باب چہارم بعنوان ''مقاصد تعلیم اقبال کا نقطۂ نظر'' میں تفصیلی بحث ملتی ہے۔ مظفر حسین نے اپنی تصنیف ''اساسِ فکر اقبال'' کے ایک مضمون ''علامہ اقبال کے فلسفہ تعلیم کا کلیدی نکتہ'' میں اس تعلیمی پہلو کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کے حوالے سے اقبال کے تصور تعلیم پر تفصیلی بحث آگے چل کر کی گئی ہے۔

کی تنقید اوران کے ساتھ اقبال کے تصور تعلیم کے تفصیلی مواز نے جیسے مباحث ضمنی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور اصل مسئلہ جو سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ اقبال کے تصور خودی کا تعلیمی عمل پر کیونکر انطباق کیا جا سکتا ہے؟

خودی، اس کی حقیقت اوراس کے مختلف علمی وفکری پہلوؤں پر کافی کام کیا جا چکا ہے۔ البتہ اقبال نے خود جس طرح سے خودی پر روشنی ڈالی ہے اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تا کہ اس کی روشنی میں تعلیمی مراحل کی تفہیم ممکن ہو سکے۔ ان کے نزدیک:

''یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بندی، ''خودی'' یا ''انا'' یا ''میں'' جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز میں نمایاں کیا ہے۔''[۱]

مذکورہ تعریف کے حوالے سے محمد احمد خاں کا یہ موقف درست معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے خودی کی روایتی منطقی تعریف (Definition) کرنے کی بجائے اس کی ماہیت کو اس کے خواص (Properties) کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے جس کے دو پہلو نمایاں ہیں۔ اولاً یہ کہ خودی وحدت وجدانی یعنی شعور (Consciousness) کا روشن نقطہ ہے اور ثانیاً یہ کہ یہی روشن نقطہ (خودی) انسان کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔[۲]

اقبال نے مذکورہ نکات کو اپنے کلام میں بار بار شعر کا جامہ پہنایا جسے ماہرین تعلیم نے اقبال کے تعلیمی اصولوں کی تشریح وتفسیر میں حوالہ بنایا ہے:

پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است[۳]

---

[۱] دیباچہ، اسرار خودی (اوّل ایڈیشن) سے اقتباس کا حوالہ پہلے باب دوم میں دیا جا چکا ہے۔
[۲] محمد احمد خاں، اقبال اور مسئلۂ تعلیم، ص: ۹۷
[۳] کلیات اقبال (فارسی) اسرار خودی، ص: ۸/۱۸

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی[۱]
خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا[۲]

''ضربِ کلیم'' میں تعلیم وتربیت کے عنوان کے تحت اقبال کے تعلیمی افکار کے کئی پہلو آشکار ہوتے ہیں:

نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارہ شناس
نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ
خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ
وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم
وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ[۳]
اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد[۴]
خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سِرّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز[۵]

خودی کو اگر انسانی شعور کا مرکزہ (Nucleus) تسلیم کرلیا جائے تو محمد احمد خان کے لفظوں میں اسی مرکزے کی بیداری اور استحکام اقبال کے نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصدِ اولین ہے۔[۶] لہٰذا ہر

---

[۱] کلیاتِ اقبال (اردو) بالِ جبریل، ص: ۵۳/ ۳۷۷
[۲] ایضاً، ص: ۸۶/ ۴۱۰
[۳] کلیاتِ اقبال (اردو) ضربِ کلیم، ص: ۵۸۴/ ۸۴
[۴] ایضاً، ص: ۵۸۹/ ۸۹/ ۵۸۸/ ۸۸
[۵] ایضاً، ص: ۵۸۸/ ۸۸، ۵۸۹/ ۸۹
[۶] ایضاً، ضربِ کلیم، ص: ۵۸۸/ ۸۸

وہ تصور تعلیم جس میں انسان کی فطری صلاحیتوں اور کیفیتوں کو ابھارنا تعلیم کا مقصد قرار دیا جاتا ہے بالکل ایسے ہی ہے جیسے جڑ کو چھوڑ کر پتوں اور شاخوں کی آبیاری کی عبث اور لا یعنی کوشش کی جائے۔[۱]

اقبال کا اصرار محض انفرادی خودی کی بیداری و استحکام پر ہی نہیں بلکہ وہ اسے اجتماعی احساسات اور مقاصد کے ہم آہنگ کرنے پر بھی زور دیتے ہیں۔ اور اس کا اظہار ان کی ابتدائی تحریروں سے بھی واضح طور پر ہوتا ہے:

''فرد کا رابطہ اتحاد اس قوم کے ساتھ جس کا وہ جزو ہے اگر بڑھ سکتا ہے تو اس دانستہ کوشش سے، تعلیم کے ذریعہ سے وہ روایات مجتمع کے جو مختلف اجزا اس طور منتقل کیے جاتے ہیں وہ نفس ناطقہ قومی میں جذب اور پیوستہ ہو کر ان چند افراد قوم کے لیے میل و فرسنگ کا کام دیتے ہیں جن کی پوری زندگی اور کُل قابلیت غور و فکر قوم کے مختلف غایات و مقاصد کی منزلیں طے کرنے میں گز جاتی ہے مثلاً ایک قوم کی قانونی، تاریخی اور علمی روایات اس قوم کے مصنفوں، مورخوں اور انشاء پردازوں کی چشم بصیرت کے سامنے ہر وقت ایک نمایاں شکل میں موجود رہتی ہیں۔ اگرچہ قوم کی مجموعی حیثیت سے ان روایات کا ادراک موہوم و مبہم طور پر ہوتا ہے۔[۲]

اقبال فرد اور اجتماع کے رشتے کی نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انفرادیت کو قائم رکھنا جتنا ضروری ہے اجتماعی مفاد کا لحاظ اس سے کہیں بڑھ کے اہم اور ضروری ہے۔ نہ تو بے لگام انفرادیت کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ یہ خود فرد کی اپنی ہستی کو ضرر پہنچانے کے مترادف ہے اور نہ ہی اجتماعیت کے معنی اس درجہ غلبہ و تسلط کے ہیں جس میں انفرادیت سسکنے پر مجبور ہو جائے۔ تعلیم کا مقصد جہاں انفرادی خودی کی بیداری اور نشوونما ہے وہیں فرد اور اجتماع کے درمیان توازن، تناسب اور ہم آہنگی پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔

اقبال ''رموز بے خودی'' کے دیباچے (اشاعت اوّل) میں اس کی وضاحت کرتے ہیں:

''جس طرح حیات افراد میں جلبِ منفعت و دفع مضرت تعینِ عمل و ذوقِ حقائق عالیہ، احساسِ نفس کے تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے اسی طرح ملل

---

[۱] اقبال اور مسئلۂ تعلیم، ص:۱۰۱

[۲] مقالات اقبال، ص:۱۷۶

واقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیات ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد قوم کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تباین وتناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے قلب مشترک پیدا ہو جائے۔'' (۱)

بظاہر یہ ایک مشکل مرحلہ ہے لیکن اقبال کی نظر اس کے عملی پہلوؤں پر بھی پوری طرح سے ہے۔ دو جانتے ہیں کہ جس طرح سے انفرادی سطح پر احساسِ نفس کا تسلسل قوت حافظہ کی بدولت قائم رہتا ہے، اجتماعی سطح پر اس کے تسلسل واستحکام کا ذریعہ قومی تاریخ کی حفاظت سے ممکن ہوتا ہے یعنی قومی تاریخ ہی دراصل حیات طیبہ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوت حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ رکھتی ہے۔ (۲)

اقبال کی نظر مروجہ تعلیمی ڈھانچے پر بڑی گہری ہے۔ وہ خودی کی آزادی، ارتقا اور استحکام کے لیے ذہنی رہنمائی کو ناگزیر تصور کرتے ہیں اور ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب انفس اور آفاق، روح اور مادے یعنی مذہب اور سائنس دونوں کا امتزاج تعلیم کا مطمح نظر ہو کیونکہ سائنس سے انسان کو بے پناہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جسے دینی رہنمائی سے حاصل ہونے والی اخلاقی قوت کو مطیع کر کے ہی خودی فطرت کو مسخر کرتی اور اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ (۳)

تعلیم کا ایک ایسا جامع اور ارفع تصور قائم کر کے، اقبال جب اپنے عہد کی درسگاہوں پر نظر ڈالتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ نوجوان نسل کی علمی وفکری تربیت میں ان درسگاہوں کا کردار ہر لحاظ سے مثالی نہیں تو وہ اپنے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں:

'موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کا عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے، حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان، بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔' (۴)

---

(۱) مقالات اقبال، ص: ۲۳۳

(۲) ایضاً

(۳) اقبال ریویو، جنوری ۱۹۷۹ء، ص: ۱۲

(۴) مقالات اقبال، ص: ۱۷۲

اقبال مسلم رہنماؤں کے قائم کردہ جدید اور قدیم تعلیم کے اداروں: علی گڑھ کالج، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنو کی تعلیمی مساعی کے منکر نہیں ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ایک طرف اگر جدید تعلیم کے ادارے قائم کر کے اسے ہندوستان میں معاشرتی تبدیلی کا دور آغاز قرار دیا جاتا ہے تو حقیقتاً یہ تبدیلی بھی مغربی تہذیب کی نقالی سے مختلف کوئی شے نہیں:

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ[۱]

اقبال کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے اپنے افراد میں ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے، لیکن جدید تعلیمی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہیں اور مغربی تہذیب کے مشاہیر سے شناسا اور متاثر ہیں جو عقلی و ادارکی لحاظ سے مغربی غلامی ہے جس کی وجہ سے ان کی روح صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے۔[۲]

اور دوسری طرف دینی تعلیم کے فروغ کے لیے قائم مدرسے بھی جہاں عصری تقاضوں سے چشم پوشی کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ فرسودہ اور از کار رفتہ نصاب میں بند پڑے ہیں وہیں وہ جرأت تحقیق اور اجتہادی بصیرت سے بھی عاری ہیں۔ اقبال کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہماری قوم کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظین سرانجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام وہی کے پوری طرح سے اہل ہی نہیں کیونکہ ان کا مبلغ علم اسلام تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس کے ساتھ

---

[۱] کلیات اقبال (اردو) ضرب کلیم، ص: ۶۷۹،۱۷۹

[۲] مقالات اقبال، ص: ۱۷۳،۱۷۲

انہیں تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق سے بھی آشنا ہونا چاہیے۔ (۱)

اقبال نے تقریباً ایک صدی پیشتر مروجہ نظام تعلیم کی جن خامیوں کی نشاندہی کی تھی ان کو دور کرنے اور تعلیم کو صحیح راستے پر ڈالنے کے لیے جو تجاویز پیش کی تھیں، ان پر آزادی کے بعد بھی، ستّر سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود عمل تو درکنار غور وفکر کا سلسلہ بھی شروع نہیں ہوسکا۔ تعلیم کا دو دھڑوں یا کیمپوں میں منقسم ہونا کسی المیے سے کم نہ تھا، جس نے زوال کے اثرات کو گہرا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ آج تعلیمی نظام دو کیمپوں کی بجائے تین میں منقسم ہو چکا ہے۔ سرکاری سطح پر قائم تعلیمی ادارے، غیر ملکی درسگاہوں کے ساتھ وابستہ ادارے جو معاشرے میں طبقاتی درجہ بندی کی علامت بھی سمجھے جاتے ہیں اور جہاں زیر تعلیم طبقہ علمی حوالے سے کچھ حاصل کر سکے یا نہ کر سکے البتہ دیگر اداروں کے طلبہ کے مقابلے میں خود کو ایک مخصوص احساس برتری میں مبتلا ضرور محسوس کرتا ہے اور تیسرا کیمپ دینی مدرسوں پر مشتمل ہے جو نصاب تعلیم ہی نہیں بلکہ مقاصد تعلیم کے حوالے سے بھی دوسرے دھڑوں سے الگ اپنی جداگانہ شناخت پر اصرار کرتے ہیں اور دین کو خود تک محدود کر کے گویا دوسرے تعلیمی کیمپوں کو سیکولر (جس کا ترجمہ بعض اصحاب ''لادینیت'' بھی کرتے ہیں) قرار دینے کا اعلان کرتے ہیں۔

اس منقسم بلکہ اکثر صورتوں میں اور بالخصوص نتائج کے اعتبار سے متصادم تعلیمی نظام جسے ''نظام'' کا تصور دینا بھی بعض علمی ذہنوں کے لیے خاصا مشکل ہے، کے ذریعے سے قومی یکجہتی کا حصول ممکن نظر نہیں آتا۔ اقبال اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تقسیم کا کوئی کلیسائی تصور سرے سے موجود ہی نہیں ہے لہٰذا تعلیم جیسے اہم اور بنیادی شعبے پر اس کا اطلاق قومی مفاد میں نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا تعلیمی شعبے میں جو سب سے اہم، بنیادی اور انقلابی قدم اٹھایا جاسکتا ہے وہ اسی منقسم تعلیمی نظام کو ختم کر کے ایک ''واحد نظام'' کا قیام ہے جس میں دونوں شعبوں کا مربوط اور منظم امتزاج ایک وحدت کی صورت میں سامنے آسکے:

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم (۲)

(جاری ہے)

---

(۱) مقالات اقبال، ص: ۱۷۸

(۲) کلیات اقبال (اردو) ضرب کلیم، ص: ۵۳۸،۳۸

اسلام اور پاکستان　　ڈاکٹر محمد امین

وزیر اعظم کا ادھورا سچ

اسلام اور دہشت گردی

جمہور علماء کا متفقہ بیانیہ.... موانع اور مشکلات

وزیر اعظم پاکستان جناب میاں محمد نواز شریف صاحب نے ۱۱ مارچ ۲۰۱۷ء کو جامعہ نعیمیہ لاہور میں علماء کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی اس کا ملخص تین نکات ہیں:

۱۔ یہ کہ دینی مدارس دین کے نہیں اپنے اپنے مسلک کے مبلغ تیار کرتے ہیں۔

۲۔ علماء کو دین کی انتہا پسندانہ اور دہشت گردانہ تعبیر کے خلاف نیا بیانیہ جاری کرنا چاہیے۔

۳۔ اور اسی نئے بیانیے کی روشنی میں دینی مدارس میں تعلیم دی جانی چاہیے۔

جناب وزیر اعظم کی یہ بات درست ہے کہ ہمارے دینی مدارس اپنے اپنے مسلک کے مبلغ اور داعی تیار کرتے ہیں نہ کہ دین کے۔ ان کی یہ بات بھی درست ہے کہ بعض دینی عناصر دین کی انتہا پسندانہ تعبیر کرتے ہیں جو دہشت گردی کو فروغ دیتی ہے اور یہ بھی کہ دینی مدارس کی تعلیم کو اصلاح کی ضرورت ہے اور یہ کہ ان سب امور میں علماء کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

تاہم جناب وزیر اعظم کی یہ باتیں آدھا سچ ہیں اور باقی کا آدھا سچ انہوں نے نہیں بولا، حالانکہ وہ زیادہ اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ریاست ان سب امور کی علماء سے زیادہ ذمہ دار ہے جس کی سربراہی اور نمائندگی جناب وزیر اعظم اور ان کی جماعت کرتی ہے۔ لہٰذا اپنی ذمہ داری کا ذکر ہی نہ کرنا اور ساری ذمہ داری علماء کرام اور دینی مدارس پر ڈال دینا ناانصافی بھی ہے اور زیادتی بھی۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دینی مدارس کی تعلیم فرقہ واریت کو فروغ دیتی ہے اور علماء کافی حد تک اس کے ذمہ دار ہیں لیکن ہم کہتے ہیں کہ ہماری حکومت و ریاست اور ہماری اشرافیہ و اسٹیبلشمنٹ بھی اس کی ذمہ دار ہے مثلاً کیا وزیر اعظم ہمیں بتا سکتے ہیں کہ:

۱۔ ملک میں دینی تعلیم کے انتظام کے لیے ہر مسلک کے الگ الگ امتحانی بورڈ (وفاق) کی منظوری ''حکومت'' نے کیوں دی ہے؟ سب کا ایک وفاق کیوں نہیں بنایا جب کہ اس کی قابل عمل صورتیں موجود ہیں۔ یہاں ''حکومت'' سے ہماری مراد محض مسلم لیگ ن اور میاں نواز شریف

کی حکومت نہیں بلکہ اس سے مراد ریاست واسٹیبلشمنٹ اور اشرافیہ (بشمول سیاست دان، فوج، عدلیہ، بیوروکریسی) ہے اور اس میں ماضی کی حکومتیں بھی شامل ہیں، اگرچہ اس وقت میاں نواز شریف ہی ریاست اور اسٹیبلشمنٹ کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہی موجودہ صورتِ حال کے ذمہ دار اور ہمارے مخاطَب ہیں۔

۲۔ حکومت دینی مدارس کی ڈگریاں کیوں تسلیم نہیں کرتی تاکہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ معاشرے اور ریاست کے لیے مفید کردار ادا کرسکیں؟ (اس وقت حکوت صرف عالیہ اور عالمیہ کی بالائی ڈگریوں کو محدود مقاصد کے لیے تسلیم کرتی ہے.... جب کہ دینی مدارس محدود اور ناگزیر حد تک عصری علوم کی تدریس وتفہیم کے لیے تیار ہیں) حالانکہ بظاہر وہ دینی مدارس کو جدید بنانے (یعنی ان کی ماڈرنائیزیشن Modernization) اور انہیں تعلیم کے مرکزی دھارے میں لانے (یعنی ان کی Mainstreaming) کے دعوے کرتی ہے۔

۳۔ حکومت نے یہ قانون کیوں بنا رکھا ہے کہ ملک میں کوئی شخص مسجد اور مدرسہ نہیں بنا سکتا جب تک وہ اپنی درخواست میں اپنے مسلک کا ذکر نہ کرے؟

۴۔ حکومت نے مسلک کی بنیاد پر دینی سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن کی اجازت کیوں دی ہوئی ہے؟

۵۔ حکومت نے دینی مدارس کے نصابات اور نظام کی اصلاح کے لیے آج تک کوئی سنجیدہ کوشش کیوں نہیں کی؟ جب کہ ملک میں ایسے معتدل مزاج علماء کرام موجود ہیں جن کی مدد اور مشاورت سے حکومت یہ کام کرسکتی ہے۔

۶۔ حکومت اربوں روپے ہر سال جدید تعلیم پر خرچ کرتی ہے۔سوال یہ ہے کہ دینی تعلیم کے لیے اس کا بجٹ کتنا ہوتا ہے؟ کیا دینی مدارس کو لائبریری کتب فراہم کرنے اور کھیلوں کا سامان مہیا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں؟ حکومت اور HEC اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو کروڑوں روپے کی گرانٹ دیتے ہیں، دینی مدارس کو ان کا حصہ کیوں نہیں ملتا؟

۷۔ دینی مدارس کے ساتھ سوتیلی ماؤں جیسا سلوک کیوں ہوتا ہے؟ مثلاً جدید یونیورسٹیوں میں دوسرے ممالک کے طلبہ کے تعلیم حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں تو دینی مدارس پر یہ پابندی کیوں ہے کہ وہ غیر ملکی طلبہ کو داخلہ نہیں دے سکتے؟

۸۔ نیشنل ایکشن پلان میں دہشت گردی کے خلاف اقدامات میں اور آئین میں ترمیم کر کے فوجی عدالتیں قائم کرتے وقت صرف مذہبی انتہا پسندی اور مذہبی دہشت گردی کو کیوں واحد عنصر کے طور پر ٹارگٹ کیا جاتا ہے؟ اور دینی مدارس کو اس کا ذمہ دار قرار دے کر ان کی رجسٹریشن، آمدنی کی مدات، حسابات کا آڈٹ، جیومیپنگ (Geo Mapping) وغیرہ کے نام پر ان پر سختیاں کی جاتی ہیں جب کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کے دوسرے خارجی اور داخلی عوامل پر غور ہی نہیں کیا جاتا اور نہ ان کے سدباب کے لیے کوئی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔

۹۔ شیعہ سنی قتال ہو، مساجد و مزارات پر حملے ہوں یا دہشت گردی کی دیگر کاروائیاں، سب جانتے ہیں کہ ان کی پشت پناہی بعض بیرونی حکومتیں کرتی ہیں لیکن ہمارے علم میں نہیں کہ ہماری حکومت نے اس میں ملوث بیرونی حکومتوں سے کبھی دوٹوک بات کی ہو، ان کو شٹ اپ کال دی ہو یا ان کے خلاف ایکشن کی دھمکی دی ہو؟

۱۰۔ بعض لوگوں کی اس بات میں کتنا وزن ہے کہ ہماری حکومت اور اسٹیبلشمنٹ خود فرقہ واریت کو فروغ دینا چاہتی ہے تاکہ علماء اور دینی جماعتیں آپس میں لڑتی رہیں، کمزور ہوتی رہیں اور ان کی ہوا خیزی ہوتی رہے تاکہ وہ سکون سے ووٹ لے کر اپنی حکومتیں چلاتی رہیں؟

تلک عشرة کاملة ۔ ہماری ریاست، حکومت، اشرافیہ، اسٹیبلشمنٹ (بشمول سیاست دان، عدلیہ، فوج، بیوروکریسی وغیرہ) کو ہمارے اٹھائے گئے ان دس نکات پر غور کرنا چاہیے اور ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے چاہئیں؟

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ بعض دینی عناصر میں جو انتہا پسندانہ سوچ پائی جاتی ہے، جمہور علماء کو اس کی مذمت کرنی چاہیے اور ایسا بیانیہ جاری کرنا چاہیے جس سے اس سوچ کی نفی اور مذمت ہوتی ہو۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں بعض عناصر دین کی انتہا پسندانہ تعبیر کرتے ہیں اور یہ چیز دہشت گردی کو فروغ دے رہی ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس کی زیادہ ذمہ داری بھی جمہور علماء اور عمومی دینی مدارس پر نہیں ڈالی جاسکتی بلکہ اس کی حقیقی ذمہ دار ہماری حکومت (یعنی ریاست و اسٹیبلشمنٹ اور اشرافیہ) ہے۔ اس لیے کہ دین کی یہ انتہا پسندانہ اور متشددانہ تعبیر نتیجہ ہے ہماری اسٹیبلشمنٹ کے رویوں اور اقدامات کا جو بنیادی طور پر دو ہیں:

ایک: ہماری اسٹیبلشمنٹ نے مغرب (امریکہ و یورپ) کی افغانستان کے خلاف جنگ

کی نہ صرف حمایت کی بلکہ افغانستان کے مسلمان بھائیوں کو کچلنے میں ان کی بھرپور مدد کی۔ پھر فاٹا اور قبائلی علاقوں کے جو لوگ اپنے افغان بھائیوں کی حملہ آور کفار کے خلاف جہاد میں مدد کرنا چاہتے تھے، ہماری قیادت نے امریکہ اور نیٹو کے دباؤ میں آ کر ان پر حملہ کیا۔ جب پہل ہماری اسٹیبلشمنٹ نے کی تو قبائل کو بدرجۂ مجبوری اپنی جان بچانے کے لیے لڑنا پڑا۔ اس پر ہماری حکومت نے انہیں دہشت گرد قرار دے دیا۔ ہماری اسٹیبلشمنٹ اس جنگ کا خرچہ امریکہ سے علی الاعلان لیتی رہی اور اب بھی لے رہی ہے، تو یہ کس کی جنگ ہے؟ ظاہر ہے یہ امریکہ کی جنگ ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے۔ تو اپنے آدمیوں کے خلاف یہ جنگ خود ہماری اسٹیبلشمنٹ نے چھیڑی ہے اور اپنی انتہاپسندی اور مغرب کی غلامی پر غور کرنے کی بجائے قبائلیوں کو انتہاپسند اور دہشت گرد کہہ رہی ہے جن پر جنگ خود اس نے مسلط کی ہے۔

پھر جس کافر دشمن (مغرب) نے امریکہ کی سربراہی میں افغانستان پر ناجائز حملہ کیا (حالانکہ ۱۱/۹ کے حملے میں کوئی افغانی شامل نہ تھا اور نہ افغانستان کا کوئی قصور تھا سوائے اس کے کہ طالبان حکمران اپنی سمجھ کے مطابق اپنے ہاں اسلام نافذ کر رہے تھے) اس نے پاکستان کے خلاف چومکھی جنگ چھیڑ دی۔ وہ آپ کے دشمن بھارت کو افغانستان میں لے آیا اور اس کی مدد سے اس نے افغان سرزمین کو آپ کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بھارتیوں اور افغانوں کے ذریعے پاکستان میں مداخلت کار بھیجنے شروع کیے جنہوں نے پاکستان میں دہشت گردی شروع کر دی۔ پھر آپ نے اپنے جن قبائلیوں کے خلاف امریکی دباؤ میں آ کر جنگ چھیڑی، امریکہ اور نیٹو نے ان کے بعض عناصر کو خرید لیا، ان میں اپنے آدمی داخل کر دیے اور اب یوں لگتا ہے کہ ان کے اکثر لوگ امریکہ و بھارت کی سازشوں کا شکار ہو کر پاکستان کے خلاف دہشت گردی کی کاروائیوں میں شرمل ہو گئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب تحریک چلتی ہے تو بظاہر اس کا فوری سبب خواہ کوئی دوسرا امر ہو لیکن بے چینی کا حقیقی سبب بننے والے عوامل، خواہ انہیں نان ایشو قرار دے کر پیچھے دھکیل دیا گیا ہو اور وہ خفتہ حالت میں پردے کے پیچھے پڑے ہوں، وہ ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں مثلاً ہمارے ہاں بھٹو صاحب کے خلاف تحریک کا فوری سبب انتخابی دھاندلی تھی لیکن لوگوں میں بے چینی کی حقیقی وجہ بھٹو حکومت کا اسلام مخالف رویہ تھا چنانچہ انتخابی دھاندلی کے خلاف چلنے والی تحریک 'تحریکِ نظامِ مصطفیٰ' میں ڈھل گئی۔ اسی طرح اگرچہ پاک حکومت اور قبائلیوں میں لڑائی کا فوری

سبب امریکی مداخلت کے خلاف مزاحمت تھی لیکن اس جدوجہد میں نفاذِ شریعت کا وہ پہلو ابھر کر سامنے آ گیا جو پاکستان کی جمہوری حکومتوں کی وجہ سے اور نفاذ اسلام بذریعہ جمہوریت کی قائل دینی جماعتوں کی ناکام جدوجہد کی وجہ سے، دبا پڑا تھا لہٰذا اب قبائلیوں کا مطالبہ ایک تو یہ تھا کہ پاکستان امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ سے باہر نکل آئے کہ یہ جنگ درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے(جیسا کہ عراق ، لیبیا، یمن، مصر، شام اور فلسطین میں مغرب کے کردار سے واضح ہے) اور یہ پاکستان کو کمزور کرنے اور ٹکڑوں میں بانٹنے کے لیے ہے۔ اور اگر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ امریکہ کی بپا کردہ اس جنگ سے باہر نکل آتی ہے تو پاک فوج اور قبائل کی یہ آویزش خود بخود ختم ہوجائے گی۔ بلکہ اب ان کا دوسرا مطالبہ بھی ابھر کر سامنے آ گیا اور وہ یہ کہ پاکستانی حکومت ملک میں شریعت نافذ کرے .... جبکہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ شریعت نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ مغرب کی جمہوریت، اس کے سرمایہ دارانہ نظام، اس کے نظام تعلیم اور اس کی ثقافتی پالیسی.... پر عمل کر رہی ہے اور کرنا چاہتی ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ وہ اس کی اہل نہیں۔ لہٰذا پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور اس کے سارے ادارے نفاذ شریعت کے لیے تیار نہیں اور اس کے لیے اس کے پاس حیلوں، بہانوں اور جواز کی کمی نہیں۔

یہ باتیں جو ہم نے کہی ہیں، ایک طرح سے قصۂ ماضی ہیں لیکن حالات کی صحیح تفہیم کے لیے ان کا ذکر ضروری تھا۔ آج کے حالات کیا ہیں؟ انہیں سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کا ادراک ضروری ہے:

❁ امریکہ اور نیٹو پوری کوشش کے باوجود افغانستان میں طالبان کو ختم نہ کر سکے۔ امریکہ کا، جو اس مہم کا سربراہ تھا، مالی اور جانی نقصان بڑھتا گیا اور داخلی حالات کے دباؤ اور جنگ کی طوالت نے اسے بے حال کر دیا اور امریکہ اور نیٹو ناکام ہو کر افغانستان سے نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ تاہم جانے سے پہلے انہوں نے افغانستان میں اپنی کٹھ پتلی حکومت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی، کچھ اپنی فوج بھی وہاں رکھی تا کہ طالبان ملک پر قبضہ نہ کر لیں۔

❁ دوسری طرف اس نے بھارت کو افغانستان میں جمے رہنے دیا اور کراچی، بلوچستان اور خیبر پی کے میں مضبوط ٹھکانے بنا کر پاکستان میں دہشت گردی کو پروان چڑھانے اور جاری رکھنے کا موقع دیا۔

❁ پاکستان میں مغرب کا ایجنٹ مشرف نامقبول ہوا تو جمہوری چہرہ رکھنے والے زرداری صاحب کو لایا گیا تاکہ پاکستان میں امریکی پالیسیاں جاری رہ سکیں۔ پھر زرداری صاحب کے بعد نواز شریف صاحب کو لایا گیا تو اس شرط پر کہ مغربی اور امریکی پالیسیاں جاری رہیں گی۔ جب امریکی اس میں کچھ ڈھیل دیکھتے ہیں تو عسکری قیادت کو بڑھاوا دے دیتے ہیں چنانچہ نواز شریف کی مقامی طالبان کو مرکزی دھارے میں لانے کی کوششیں اس وقت سبوتاژ ہو گئیں جب عسکری قیادت نے امریکی دباؤ پر وزیرستان میں آپریشن شروع کر دیا۔ امریکی اس سازش میں بھی کامیاب ہو گئے اور اس آپریشن کے نتیجے میں پاکستانی طالبان سو فیصد بھارت کی مٹھی میں چلے گئے اور مقامی آبادی دربدر ہو کر پاکستان سے متوحش ہو گئی۔

❁ مغرب کی فکری اور عملی غلامی کے نتیجے میں اندرون ملک نواز حکومت کی سیکولر اور لبرل پالیسیاں جاری ہیں۔ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا نے پاکستان میں اسلام اور اسلامی اقدار کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ نظامِ تعلیم جو پہلے ہی مغرب زدہ تھا اور یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم نوجوان نسل کے اخلاق تباہ کر رہی تھی، اسے اب سکول کی سطح پر بھی مخلوط کر دیا گیا اور پہلی جماعت سے بلکہ پری سکول سے انگلش میڈیم شروع کر دیا گیا، تاکہ مغرب کی غلام نسل تیار کی جا سکے۔ عورتوں کو بے حیائی، فحاشی اور آزادی کے راستے پر ڈالا گیا مساوات کے نعرے لگائے گئے اور جب گھر کے مرد غیرت میں آ کر کوئی اقدام کریں تو مغربی تہذیب کے مطابق اسے ظلم قرار دیا گیا اور خواتین کے حق میں مرکز اور صوبوں میں قانون سازی کی گئی۔ اسٹیبلشمنٹ کی جرأت اتنی بڑھی کہ اس نے توہینِ رسالت جیسے حساس مسئلے کو بھی اپنی انتظامی اور سیاسی قوت سے دبا دیا اور اپنے دینی حلیفوں (مولانا فضل الرحمن، پروفیسر ساجد میر، مولانا امین الحسنات وغیرہم) کی مدد سے اس کے خلاف کوئی عوامی تحریک بھی نہ چلنے دی اور دینی قوتوں کو متحد بھی نہ ہونے دیا۔ علمی محاذ پر جمہور علماء اور روایتی دینی فکر کو زک پہنچانے اور فکری انتشار پیدا کرنے کے لیے جاوید غامدی اور عمار ناصر صاحب جیسے لوگوں نے حکومتی اور سیکولر حلقوں کی بھرپور معاونت کی۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں وزیراعظم نواز شریف نے اپنے ایک سیاسی و دینی حلیف مدرسے میں علماء سے مطالبہ کیا کہ وہ اسلام کی انتہا پسندانہ تعبیر اور دہشت گردی کے خلاف بیانیہ جاری کریں اور اسی کے مطابق دینی مدارس میں تعلیم دیں۔ اِن حالات میں جمہور علماء اور معتدل دینی قوتیں کیا کریں؟ کیا وہ وزیراعظم کی سیاسی ضرورتوں کے پیشِ نظر ایک بیانیہ گھڑ کر ان کے سامنے

پیش کریں اور دین کو بازیچۂ اطفال بنا دیں؟ ظاہر ہے علماء کرام یہ نہیں کر سکتے، تاہم جمہور علماء، جن کی علمی نمائندگی کا ایک اہم پلیٹ فارم ملی مجلس شرعی ہے، یقیناً اسلام کی انتہا پسندانہ تعبیر کے خلاف ہیں، وہ ملک میں پرامن طریقے سے نفاذ اسلام کے حامی ہیں۔ وہ دعوتی، اصلاحی اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے فرد، معاشرے اور ریاست کو اسلامی خطوط پر چلانا چاہتے ہیں اور غیر صالح حکمرانوں کو بدلنے، نفاذ شریعت اور حکومتوں کی اصلاح کے لیے خروج اور مسلح جدوجہد کے ذریعے کامیابی کو قابل عمل نہیں سمجھتے۔ لیکن پاکستانی حکومت واسٹیبلشمنٹ کا اسلامی تعلیمات اور اقدار کے خلاف اور پاکستان میں نفاذ شریعت کے خلاف اور امریکی غلامی میں ملک کو لبرل اور سیکولر بنانے کا جو ایجنڈا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے وہ اس حکومت کی پالیسیوں کی حمایت کیسے کریں؟ اور ان کی پالیسیوں کے حق میں فیصلے اور فتوے کیسے دیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ہماری سیاسی اور عسکری قیادت اور اسٹیبلشمنٹ یہ نعرے لگاتی رہتی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں عوام ہمارے ساتھ ہیں، قوم ہماری پشت پر ہے، علماء ہمارے ساتھ ہیں .... وغیرہ لیکن سچی بات یہ ہے کہ جمہور علماء اور عوام پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے اس معاملے میں حامی نہیں ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف امریکہ کی (دہشت گردی کے خلاف مزعومہ) جنگ میں شریک ہو یا امریکی دباؤ میں آ کر ملک میں شریعت نافذ نہ کرے اور اس کی بجائے اسے لبرل اور سیکولر بنانے کی کوشش کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کے محب اسلام عوام اور اعتدال پسند جمہور علماء، اسلام کی انتہا پسندانہ تعبیر اور اسلام کے نام پر دہشت گردی کے مخالف ہیں لیکن یہ سب کچھ ہماری اسٹیبلشمنٹ کا ہی کیا دھرا ہے کہ وہ مغرب پرستی میں اس کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بپا کردہ جنگ سے باہر آنے کو تیار نہیں اور نہ ملک میں نفاذ شریعت کے لیے تیار ہے بلکہ اس کے برعکس ملک میں لبرل ازم اور سیکولرازم کو فروغ دے رہی ہے۔ اگر حکومت مخلص ہے تو جمہور علماء سے ڈائیلاگ کرے، ان کے مذکورہ بالا دونوں مطالبات (امریکی جنگ سے باہر آنا اور شریعت نافذ کرنا) کو پورا کرے تو علماء بھی کھل کر اس کی حمایت کریں گے اور اس کا بھرپور ساتھ دیں گے ....تاکہ ہمارا معاشرہ جنت نظیر بن سکے، یہاں امن وسکون ہو اور مسلمان دینی تعلیمات پر عمل کر کے دنیا میں بھی کامیاب وکامران ہوں اور آخرت میں بھی اللہ کے حضور سرخرو ہو سکیں۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین.

اسلام اور پاکستان پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان کا مستقبل.... اسلام یا سیکولرزم؟

فیصل آباد میں مجلس مذاکرہ کی روداد

البرہان فورم کے زیر اہتمام فیصل آباد میں یہ چوتھی مشاورت تھی جس میں پاکستان کے مخدوش اسلامی مستقبل اور مغربیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کے ازالے کی حکمت عملی پر گفتگو ہوئی۔ اس سے پہلے لاہور، گوجرانوالہ اور اسلام آباد میں اس طرح کی نشستیں ہو چکی ہیں جن میں اہل فکر و نظر نے اپنی گفتگو سے کئی نئے پہلو روشن کیے۔ فیصل آباد کی نشست میں جو ۱۲ مارچ ۲۰۱۷ء بروز اتوار منعقد ہوئی، ڈاکٹر زاہد اشرف صاحب، پروفیسر حکیم منصور العزیز صاحب، پروفیسر قاری عبدالخالق صاحب، مولانا محمد شریف صاحب، محمد بن اشرف صاحب، محبوب الزمان بٹ صاحب، چوہدری خالد محمود صاحب، شیخ محمد مشتاق صاحب، حکیم حامد اشرف صاحب، نور احمد صاحب اور جاوید اشرف صاحب کے علاوہ کوئی بیس افراد نے شرکت کی۔ لاہور سے مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین اور راقم الحروف نے جوہر آباد (خوشاب) سے شرکت کی۔ اپنی افتتاحی گفتگو میں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے کہا کہ پاکستانی معاشرہ اس وقت ایک فکری تناؤ کا شکار ہے۔ تمام تر اسلامی غلغلہ کے باوجود دینی قوتیں پسپا ہو رہی ہیں، سیکولرزم اور لبرل ازم کے جھنڈے اٹھائے گاڑی آگے بڑھ رہی ہے۔ علماء کرام مسلکی جھگڑوں میں پڑے ہیں۔ اسلامی فکر کے حامل دانشور مایوسی کا شکار ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے ادارے اباحیت اور بے راہ روی پھیلا رہے ہیں جب کہ دینی تعلیم کے ادارے اسلامی شخصیت کی تعمیر کی بجائے مسلکی فکر کو فروغ دے رہے ہیں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں بعض سیکولر دانشوروں نے طوفان برپا کر رکھا ہے حب کہ ازالہ کرنے والی چند ایک نحیف و نزار آوازیں ہیں جن کا بس نہیں چل رہا۔ ڈاکٹر امین صاحب کی تعارفی گفتگو کے بعد ایک شریک محفل نے صدا لگائی کہ سب کچھ ہے لیکن جو چیز نہیں ہے وہ اسلامی حلقوں کے صدق و اخلاص، فراست اور عمل میں کوتاہی ہے جبکہ سیکولر قوتیں پورے جوش اور ولولے کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر زاہد اشرف صاحب نے، جو اس علمی مشاورت کی رابطہ کاری کر رہے تھے، کہا کہ اسلامی حلقوں میں قیادت کا فقدان ہے۔ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی اپنی اپنی مسجد بنا رکھی ہے۔

اجتماعیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ یہ جو بے دینی کا طوفان اٹھایا گیا ہے اس کا مقابلہ اجتماعی جدوجہد سے ہی کیا جاسکتا ہے لیکن اسلامی دانشور اور علماء کرام اکٹھے ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ پروفیسر حکیم منصور العزیز صاحب، جو طبی حکمت کے ساتھ دینی معاشرتی حکمت سے بھی مالا مال ہیں، کہا کہ دینی قوتوں کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے بس عمل اور یکجہتی کی کمی ہے۔ اگر ان کمزوریوں پر قابو پالیا جائے تو پاکستان کا مخدوش اسلامی مستقبل، پاکستان کا روشن اور کامیاب اسلامی مستقبل بن سکتا ہے۔ ایک صاحب نے جو غالباً کسی مدرسے کے مہتمم تھے فرمایا کہ نہ حاجیوں کی کمی ہے نہ حافظوں کی، اسی طرح تبلیغی اجتماع، سنتوں بھرے اجتماع اور دینی جماعتوں کے اجتماعات میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں۔ دینی مدارس سے علم حاصل کرنے والوں کی کمی بھی دیکھنے میں نہیں آتی لیکن اس کے باوجود دینی قوتیں پسپا ہو رہی ہیں تو وجہ ایک ہی نظر آتی ہے کہ دین کا تصور مسخ ہو گیا ہے۔ سطحیت آ گئی ہے اور دین کا صحیح اور گہرا علم عنقا ہو گیا ہے۔

حکیم حامد اشرف صاحب نے مغربی تہذیب کی یلغار کی بات کی۔ بھارت کی طرف سے آنے والی ثقافتی یلغار کا بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ ہم یہود و ہنود کی تہذیبی سازش کا شکار ہو گئے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہماری دینی جماعتیں بھی اب اسلام کا نام لیتے ہوئے شرماتی ہیں۔ وہ بھی نام نہاد ترقی پسند رہنے کے لیے الٹے سیدھے اقدامات کر رہی ہیں جس سے ان کے کارکنوں میں یکسوئی کی بجائے انتشار، مایوسی اور بے عملی پیدا ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری دینی جماعتیں مسلکی جماعتیں بن کر رہ گئی ہیں جو مسلمانوں کو تقسیم کرنے کا باعث ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ معاشرتی رسم و رواج میں اسلام کی بجائے مغربی تہذیب اور ہندو تہذیب کا چرچا ہے۔ ویلنٹائن ڈے جیسی خرافات تفریح کے نام پر فروغ پا رہی ہیں۔

محبوب الزمان بٹ صاحب نے نکتہ اٹھایا کہ کیا اب کوئی زیادہ زوال شروع ہو گیا ہے؟ کیا ماضی میں تیس چالیس سال پہلے بھی یہی رونا نہیں رویا جاتا تھا؟ انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں میڈیا نے فرق ڈالا ہے اور اسلامی قوتوں کا زوال زیادہ اُجاگر کیا ہے۔

چوہدری خالد محمود صاحب سابق سیشن جج اور حال ڈائریکٹر سرگودھا یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس نے کہا کہ تعلیم و تربیت تعمیرِ شخصیت میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں اور اگر ہم اخلاص، جذبے اور محنت سے کام کریں تو طلبہ و طالبات کی ایسی تربیت کی جاسکتی ہے کہ وہ پاکستانی

معاشرے میں مفید اور مثبت کردار ادا کرسکیں۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے ادارے کی کئی مثالیں پیش کیں۔

شرکاءِ محفل میں سے اکثر کی یہ رائے تھی کہ برائی منظم ہے اور اچھائی منتشر ہے۔ دینی مدارس اپنا رول درست طریقے سے ادا نہیں کررہے۔ دینی فکر کے حاملین کاہلی کا شکار ہیں۔ فرقہ واریت نے معاشرے کو خراب کردیا ہے اور دینی قوتوں کا اثر ورسوخ کمزور پڑ گیا ہے۔ بعض نام نہاد دانشور جو اسلام کا ٹھپّا لیے ہوئے ہیں، وہ زیادہ خرابی کا باعث بن رہے ہیں خصوصاً جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے شاگرد اسلامی علم الکلام کو استعمال کرتے ہوئے سیکولرزم اور لبرل ازم کے پرچارک بن گئے ہیں۔ کئی احباب نے اخلاقی اور ذہنی تخریب کی طرف توجہ دلائی جو معاشرے کے اخلاقی تاروپود کو اُکھاڑ رہی ہے۔

آخر میں اتفاق رائے اس بات پر تھا کہ اسلامی قوتوں کو متحد ہوجانا چاہیے۔ دینی تعلیم کے اداروں میں مسلک کی بجائے اسلام کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ نصابات تعلیم میں اتحاد اور یکجہتی کی تعلیم پر زور ہو۔ خطبہ ہائے جمعہ کا مثبت استعمال ایک منصوبہ بندی کے تحت کیا جائے۔ علماء کرام اپنا رول ادا کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ جدید تعلیم اور میڈیا کو درست سمت دینے کی کوشش کی جائے۔ پارلیمنٹ میں زیادہ سے زیادہ علماء کرام پہنچانے کی حکمت عملی اپنائی جائے۔ دینی جماعتیں انتخابات میں متحد ہوکر میدان میں اتریں۔ سیکولر جماعتوں کو بتایا جائے کہ اگر وہ اپنے پلیٹ فارم سے کسی عالم دین کو انتخابی ٹکٹ دیتے ہیں تو کوئی دینی جماعت اس کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ علماء کرام کے پارلیمنٹ میں جانے کی راہ ہموار کی جائے۔

یہ بات بھی مشترکہ طور پر سامنے آئی کہ حکومتی تبدیلی معاشرتی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا ہمیں چاہیے معاشرتی تبدیلی اور تعمیر پر توجہ کریں اور یہ بات بھی طے شدہ نظر آئی کہ فرد کی تبدیلی صرف اور صرف تعلیم سے ہی ممکن ہے۔ اس میں سکولوں کالجوں کی تعلیم بھی ہے، دینی مدارس کی تعلیم بھی ہے اور مساجد میں ہونے والی تعلیم بھی ہے جو زیادہ تر خطبہ ہائے جمعہ کے ذریعے انجام پاتی ہے۔

فہم دین

ڈاکٹر محمد امین

انسان عبد ہے یا خلیفہ؟

اللہ تعالیٰ واحد خالق ہے اور ساری دنیا اس کی مخلوق۔ اللہ تعالیٰ واحد معبود ہے اور ساری دنیا اس کی عبادت گزار۔ عالمِ ملائکہ، عالمِ جن، عالمِ انسان، عالمِ حیوانات، عالمِ جمادات، عالمِ نباتات سب اس کی عبادت کرتے ہیں، سب اس کی پرستش کرتے ہیں اور سب اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ البتہ سب کی پرستش اور اطاعت کے انداز اور طریقے جدا جدا ہیں۔ عالم ملائکہ، عالم حیوانات، عالم جمادات اور عالم نباتات ایسے عبد (یا عباداللہ) ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت جن کی جبلّت اور سرشت میں رکھ دی گئی ہے۔ یہ ان کی فطرت میں (In built) موجود ہے، یہ اس کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتے۔ پرندے اڑتے ہیں چہچہاتے ہیں، اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ یہ ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اڑنا چھوڑ کر رینگنا شروع کر دیں یا انڈے دینے کی بجائے بچے دینا شروع کر دیں۔ جمادات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہاڑوں کے پتھر اللہ کے خوف سے لرزتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور بعض میں سے چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔ عالم حیوانات کا بھی یہی حال ہے۔ بھینس چارہ کھاتی ہے تو اس سے دودھ بنتا ہے۔ وہی چارہ بھینسا کھاتا ہے تو دودھ نہیں بنتا۔ اللہ تعالیٰ نے جس حیوان کو جس غرض سے پیدا کیا ہے اور جو نظام اس کے لیے رکھا ہے وہ اسی کا اتباع کرتا ہے وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا، کر ہی نہیں سکتا۔

صرف دو عالم ایسے ہیں جن کو اللہ نے عبد کے ساتھ خلیفہ بھی بنایا ہے ایک انسانوں کا اور دوسرا جنّوں کا۔ خلیفہ بنانے کے دو مطلب ہیں: **ایک** یہ کہ انہیں اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو اللہ کی عبادت کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ عبادت یا عبودیت عربی زبان میں ایک جامع لفظ ہے جس کے معانی بہت وسیع ہیں۔ مختصر طور پر سمجھیے کہ اس میں دو مفہوم غالب ہیں ایک پرستش کا اور دوسرے اطاعت کا۔ گویا اللہ کی عبادت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی پرستش واطاعت کی جائے۔ اب قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ [illegible] لِيَعْبُدُوْنِ ﴿56﴾ [الذاریات ۵۱:۵۶] یعنی مَیں نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ گویا انسان کو چاہیے کہ ہر حال میں صرف اللہ کی عبادت واطاعت کرے۔ عبادت و پرستش کا

صرف اللہ کے لیے ہونا تو واضح ہے، اطاعت بھی درحقیقت صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ باقی سب اطاعتیں اللہ کے حکم کی اطاعت میں ہیں اور اس کی اطاعت سے مشروط ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ [illegible] [النساء ۴:۵۹] اور حکم دیا کہ [illegible] اِحۡسَانًا [البقرہ ۲: ۸۳] پس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اللہ کے حکم کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح حکمرانوں (اُولی الامر) اور والدین کی اطاعت بھی اللہ کے حکم کی وجہ سے ہے۔ غرض مخلوق اور انسانوں کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے تابع اور اس سے مشروط ہے۔ اگر حکمران یا والدین یا آجر (Employer) اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کا حکم دے یا ایسے کام کا حکم دے جو اللہ کے احکام کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

تو خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت اور بندگی کے لیے پیدا کیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرے اور اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرے الّا یہ کہ وہ اللہ کی اطاعت کے تحت ہو یا اس کی موافقت میں ہو۔

لیکن انسان کو اللہ نے یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کی عبادت کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ لیکن ساتھ ہی اسے تفصیل سے یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ انسان کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرے اور عقل ودانش کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرے کیونکہ اس کے علاوہ ساری کائنات (ملائکہ، حیوانات، جمادات، نباتات) سب اللہ کی عبادت کر رہے ہیں لہٰذا وہ بھی اللہ کی عبادت کا رویہ اپنائے گا تو گویا ساری کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہیں کرے گا تو گویا ساری کائنات سے مزاحم ہوگا، سب کے خلاف چلے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے عدم عبادت کا دروازہ اس کے لیے کھلا ضرور رکھا ہے [illegible] وَتَقۡوٰىهَا ﴿۸﴾ [الشّمس ۹۱:۸] یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان میں معصیت پر قادر ہونے اور تقویٰ اختیار کرنے دونوں کا مادہ بیک وقت انسان کے اندر رکھا ہے) لیکن اس کے انجامِ بد سے بھی اس نے خبردار کیا ہے کہ دنیا میں رزق تو مَیں ہر کافر اور مسلم کو دوں گا لیکن جو اللہ کی عبادت واطاعت سے منہ موڑے گا وہ دنیا میں اطمینانِ قلب سے محروم رہے گا اور فساد کا مرتکب ہوگا اور آخرت میں ہمیشہ کی رسوائی، ناکامی اور تعذیب اس کا مقدر ٹھہرے گی۔

انسان کو دوسرا اختیار اس نے یہ دیا ہے کہ وہ کائنات میں تصرف کر سکتا ہے۔ کائنات کی ہر

چیز اس کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اسے علم الاسماء سے نوازا گیا HIZ IF" @ j yUD
کُلَّھَا [البقرہ ۲:۳۱] لہٰذا وہ کائنات میں جیسے چاہے تصرف کرسکتا ہے لیکن قرآن حکیم نے ساتھ یہ بھی بتادیا ہے کہ وہ حاکم مطلق نہیں کہ جو چاہے کرے اور جیسے چاہے کرے بلکہ وہ خلیفہ ہے اور خلیفہ کا کام یہ ہے کہ اصل حاکم کے اختیارات وہ اصل حاکم کی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کرے لہٰذا اللہ کا خلیفہ ہونے کا بھی یہی تقاضا ہے کہ وہ زمین میں تصرف اللہ کی رضا اور اس کے حکم اور تعلیمات کے مطابق کرے نہ کہ بطور حاکم جو چاہے، اور جیسے چاہے خود مختاری کے ساتھ جو چاہے کرتا پھرے۔

گویا خلیفہ ہونے کے باوجود انسان کے عبد ہونے کی حیثیت برقرار اور غالب رہتی ہے اور اس کا یہ بنیادی کردار اس کے سامنے رہتا ہے اور رہنا چاہیے کہ وہ کوئی خود مختار یا مطلق العنان مخلوق نہیں بلکہ اللہ کا حقیر عبد ہے اور اسے عبدیت ہی زیبا ہے اور عبدیت ہی کے مطابق اسے زندگی گزارنی ہے۔

ورلڈ ویو

ورلڈ ویو میں تین امور زیر بحث آتے ہیں۔ ۱۔تصورِ الٰہ، ۲۔تصورِ انسان، ۳۔تصورِ کائنات۔ اسلامی تہذیب کا ورلڈ ویو یہ ہے کہ ایک اللہ خالق و مالک و ربّ ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے، وہ زندگی اور موت پر قادر ہے، انسان کا نفع ونقصان اور غم وخوشی اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ علیم وخبیر ہے۔ وہ ہادی ہے، وہ منبع علم ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسلام کا تصورِ انسان یہ ہے کہ انسان اللہ کا عبد ہے، وہ اس کا بندۂ بے دام ہے، وہ اس کی پرستش کرتا ہے، وہ اس کا مطیع اور فرمانبردار ہے۔ اللہ کی عظمت وکبریائی کے مقابلے میں حقیر، بے مایہ اور ذرۂ ناچیز ہے۔ اللہ ہر عیب سے پاک ہے جب کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اللہ ہر احتیاج سے بے نیاز ہے جب کہ انسان ہر بات میں اس کا محتاج ہے۔

اور اسلام کا تصورِ کائنات یہ ہے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہ دار العمل ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ دنیا کی زندگی انفرادی اور اجتماعی، اللہ کے احکام اور اس کی مرضی کے مطابق بسر کرے تاکہ اس چند روزہ زندگی کے بعد کل جو دائمی اور ابدی زندگی آنے والی ہے، اس میں انسان کامیاب ہوجائے۔ اس کا آقا و مالک، اس کا ربّ اس سے راضی ہوجائے، اس سے خوش ہوجائے، اسے

اپنی نعمتوں سے نوازے اور اسے اپنے دیدار سے نوازے۔

اللہ کی کتاب قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ اور اللہ کے پیغمبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی گفتار (تعلیمات) وکردار (عملی زندگی) کا ایک ایک لمحہ اور گوشہ اللہ کی کبریائی، انسان کی عبدیت اور دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا عکاس ہے خصوصاً قرآن حکیم میں انبیاء کرام (حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت یونس، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی دعائیں دیکھیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو دعائیں مانگی ہیں، خصوصاً طائف میں بے بسی اور بے کسی کی حالت میں جو دعا مانگی اور جو دعائیں مانگنا ہمیں سکھائی ہیں، ان میں اللہ کی کبریائی، انسان کی عبدیت اور آخرت کا استحصار ہی مرکزی موضوع ہیں۔ قرآن وسنت نماز اور کثرت ذکر کی تلقین سے بھرے پڑے ہیں۔ اللہ کے ذکر کے اجزاء کیا ہیں؟ تسبیح (سبحان الله یعنی اللہ کی پاکیزگی وتقدس کا اعلان کہ وہ ہر خامی وعیب سے پاک اور ہر احتیاج سے ماورا ہے)، تکبیر (الله اکبر یعنی اللہ کی کبریائی اور بڑائی کا اعلان)، تحمید (الحمدلله یعنی اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کا شکر، تہلیل (لا حول ولا قوۃ الّا بالله یعنی یہ اعلان کہ قوت وخیر کا منبع اے اللہ آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ آپ ہی کی توفیق سے ہم ہدایت پاتے، اس پر قائم رہتے اور آپ کی عبادت واطاعت کے قابل ہوتے ہیں۔

نماز کیا ہے؟ غلاموں کی طرح اللہ کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوجانا، اس کے آگے جھک جانا اور اس کے آگے ماتھا ٹیک دینا اور بار بار اٹھتے بیٹھتے اعلان کرنا کہ الله اکبر، الله اکبر اے اللہ آپ بڑے ہیں، آپ ہی بڑے ہیں (اور مَیں آپ کا حقیر بندہ ہوں)۔ قیام، رکوع، سجود، قعدہ میں جو الفاظ آپ بار بار دہراتے ہیں ان پر غور کیجیے وہ اللہ کی کبریائی اور انسان کی عبدیت کا بے مثال اظہار ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے عبادت کا مرکز مسجد کو بنایا اور اسے پرستش واطاعت کا ایک ماڈل بنا کر دکھا دیا جس میں نہ صرف نماز پڑھی جاتی تھی اور اللہ کا ذکر کیا جاتا تھا بلکہ آپ نے اس میں تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کا بھی انتظام کیا تاکہ تعمیر فرد کے ذریعے ایسی شخصیت وجود میں آسکے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا سکے اور اس مسجد کو معاشرت، معیشت، سیاست، عدالت اور جنگی ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرکے اسے اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق استوار کرنے کا نمونہ بھی بنا کر دکھا۔

اسلام اور مسلمان کا مطلب

بلکہ آپ مزید غور کیجیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ عبدیت اور عبودیت کے اس تصور کے بغیر اسلام کے کوئی معنی نہیں اور نہ ہمارا مسلمان ہونا کوئی معنویت رکھتا ہے کیونکہ عربی زبان میں اسلام کا مادہ ہے س ل م جس کا ایک معروف معنی ہے ''سرِ تسلیم خم کرنا''۔ گویا لغوی لحاظ سے بھی اسلام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے خالق و مالک اور ربّ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے، بلا شرط، بلا چوں و چرا اور بلا حدود اللہ کی غیر مشروط اطاعت کرے۔ یہ ہے 'اسلام' یعنی عبادت اور بندگی کا رویہ اور جو اس رویے کا حامل ہو اسے کہتے ہیں مسلم یعنی اللہ کے آگے بلا شرط بلا حدود سرِ تسلیم خم کرنے والا۔

یہ ہے اسلام اور مسلم کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم۔ گویا جو اللہ کا عبد نہیں وہ مسلم نہیں، وہ اسلام کو سمجھا ہی نہیں۔ اسلام کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان اپنی آزاد مرضی سے اپنی آزادی سے دست بردار ہو جائے اور اللہ کا عبد اور مطیع بن جائے۔ ایسی غلامی، ایسی زندگی، ایسی عبدیت جس کا کوئی کنارہ نہیں، جس کی کوئی حدود نہیں۔ اس لیے کہ جو کلمہ پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں یعنی اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ اس میں بنیادی طور پر اقرار ہی اس بات کا ہے کہ اے اللہ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں، کوئی معبود نہیں اور مَیں آپ کا عبد ہونے کا اقرار کرتا ہوں اور تیرے سوا کسی کی عبادت و اطاعت نہیں کروں گا.... اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ کیونکہ اللہ کی عبادت و اطاعت کیسے کرنی ہے یہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی بتائیں گے۔ اس پوری بات کی وضاحت دوسرے کلمہ سے ہوتی ہے جس میں پہلے کلمہ والی بات کھول کر بتادی گئی ہے۔ یعنی اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ صرف آپ ہی الٰہ ہیں (الٰہ کے وسیع معانی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کہا جاتا ہے۔ ان میں نمایاں ترین صفت معبود ہونے کی ہے یعنی انسان گواہی دیتا ہے کہ اے اللہ تو واحد معبود ہے اور میں تیرے سوا کسی اور کی عبادت و اطاعت نہیں کروں گا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اللہ کے عبد اور رسول ہیں۔ یہ گواہی، جو ہر مسلمان ہر نماز میں روزانہ اور بار بار دیتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی عبادت و اطاعت کیسے کی جائے؟ اس کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہمیں بتائیں گے اور وہی اس کا عملی نمونہ پیش کریں گے.... اور وہ بھی اس لیے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ

ان پر اپنے فرشتے کے ذریعے پیغامِ ہدایت بھجواتا ہے اور وہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کی بھی حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کے عبد ہیں۔ پس اللہ کی ساری مخلوق کی انفرادیت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبد ہے۔ انسان بھی عبد ہے۔ پیغمبر بھی عبد ہے۔ فرشتے بھی عبد ہیں۔ سب اللہ کے عبد ہیں اور انہیں عبدیت ہی زیبا ہے۔ کبریائی صرف ایک اللہ کو زیبا ہے۔

پس ہر انسان اور مسلمان بنیادی طور پر عبد ہے اور اسے عبد ہی ہونا چاہیے، اسے عبدیت ہی زیبا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں سے پوچھا تھا ïïj pYZUMOí øYpZZ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ ''ہاں'' (کیوں نہیں) گویا عبدیت انسان کی فطرت ہے اور اللہ کی عبودیت کی راہ سے ہٹنا انسان کی بنیادی فطرت کے خلاف ہے۔ عبدیت سے بھاگنا عقل و دانش کے بھی خلاف ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ïhí5' ùãf yüZ ZZ UpÔpö 3 YÜZ 7 یعنی دانائی کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی اللہ (کو ماننے) اور اس سے ڈرے۔ ظاہر ہے یہ خشیت اللہ کی عبدیت کا لازمی تقاضا ہے یعنی انسان کو عبدیت کا احساس ہوگا تو اللہ سے ڈرے گا؟ اگر اسے عبدیت کا احساس نہ ہو اور وہ خود کو عقلِ کل اور مختارِ کل سمجھے تو پھر اللہ سے کیوں ڈرے گا؟

خلاصہ یہ کہ انسان اللہ کا عبد ہے۔ اسے یہی زیبا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت و اطاعت کرے، اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور اپنی اجتماعی زندگی میں بھی (یعنی معاشرے اور ریاست کی سطح پر بھی اگر وہ ایسا کرے گا تو دنیا کے امتحان میں کامیاب ہوگا۔ اگر قوم ساتھ دے تو وہ دنیا میں بھی غالب ہوگا ورنہ اطمینانِ قلب سے سرشاری تو اسے میسر ہوگی ہی (اور یہ ایسی نعمت ہے جو کروڑوں اربوں خرچ کر کے بھی میسر نہیں آسکتی ïï# mYpüYp kÜZ ZpZÖ hí5' pÿXÜZF [الرعد ۱۳: ۲۸] اور آخرت کی زندگی کی کامیابی اور اللہ کی رضا اور خوشنودی تو اس کے لیے ہے ہی کہ اس کا وعدہ اللہ نے بے شمار دفعہ قرآن حکیم میں کیا ہے۔ [البروج: ۱۱ وغیرھا] اور اصل کامیابی تو درحقیقت آخرت ہی کی کامیابی ہوتی ہے۔ [آل عمران: ۱۸۵ وغیرھا]

تصوّرِ خلافت

خلافت کے جو دو تصور ہم نے اوپر ذکر کیے ہیں ان کے حوالے سے یاد رہے کہ یہ 'خلافت' بھی مسلم غیر مسلم سب کے لیے عام ہے۔ خلیفہ کا لفظ قرآن حکیم میں ایک تیسرے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور وہ ہے حکمرانی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں

فرمایا [illegible]
فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۢ
بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾ [ص ۳۸:۲۶]

مطلب یہ کہ ایک مسلمان اگر حکمران ہو تو وہ حکمرانِ مطلق اور آمر مطلق نہیں ہوتا کہ جو چاہے کرتا پھرے بلکہ بحیثیت حکمران بھی وہ اپنے اختیارات اللہ کی نازل کردہ تعلیمات واحکام کے مطابق ہی استعمال کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ کا عبد ہوتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اسلام کے سیاسی نظام کو خلافت انہی معنوں میں کہا جاتا ہے۔ اگرچہ حضرت عمرؓ نے خود کو خلیفہ کہلوانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کو ایک دفعہ کسی نے ''یا خلیفۃ اللہ'' کہہ کر پکارا تو انہوں نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا کہ ''میں خلیفۃ الرسول ہوں نہ کہ خلیفۃ اللہ'' یعنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین اور خلیفہ ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسند نشین ہوا ہوں۔ حضرت عمرؓ کو جب کسی آدمی نے خلیفہ کہہ کر پکارا تو وہ سوچ میں پڑ گئے کہ چلیے میں تو [illegible] یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ ہو گیا۔ پھر میرے بعد آنے والے کو کیا کہا کرو گے اس طرح تو لفظ خلیفہ کی لائن لگ جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے صحابہ کے مشورے سے اپنے لیے 'امیر المومنین' کا لقب پسند کیا۔ تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام 'خلافت' کہلایا خواہ وہ صحیح اسلامی خلافت تھی یا بعض اوقات پٹڑی سے اتری ہوئی خلافت۔

اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی بنیادی حیثیت عبد کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دعا کرنی چاہیے کہ وہ اپنے تابعدار اور متقی بندوں میں ہمارا شمار کرے، ہمارا خاتمہ خیر پر کرے اور آخرت میں اپنے نیک بندوں (انبیاء، صدیقین، شہداء) کا ساتھ ہمیں نصیب کرے۔ (آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین.

قارئینِ البرہان توجہ فرمائیں

البرہان کے قارئین سے درخواست ہے کہ اپنے فون نمبر اور ای میل سے راقم کو بذریعہ فون، خط یا SMS مطلع کریں تاکہ بوقت ضرورت آپ سے رابطہ کیا جا سکے۔

زاہد حنیف، انچارج نشر واشاعت: 0322-6871909 0300-4354673

استفسارات مدیر

جاوید غامدی صاحب کے مکتبِ فکر کی گمراہیاں

نہی عن المنکر کون کرے گا؟

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

مجھے یہ دیکھ کر تشویش ہو رہی ہے کہ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے مدیر عمار ناصر صاحب ہر مہینے اپنے رسالے میں ایک نئی گمراہی کا دروازہ کھولتے ہیں اور وہ بھی نہایت ٹھنڈے میٹھے شائستہ انداز میں، لیکن ان کا جواب کہیں سے نہیں آتا۔ سوشل میڈیا پر بھی غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں نے ادھم مچایا ہوا ہے اور وہ مسلسل اپنے گمراہ کن افکار موثر اور مدلل انداز میں پیش کرتے ہیں خصوصاً حدیث وسنت کے بخیے ادھیڑتے ہیں لیکن کوئی ان کا موثر انداز میں جواب نہیں دیتا۔ کیا البرہان اس سلسلے میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتا؟ نعیم الرحمن (میلسی)

البرہان

بھائی! ہم آپ سے متفق ہیں کہ غامدی صاحب، عمار ناصر صاحب اور ان کے گروپ کے دیگر افراد اپنے گمراہ کن افکار مسلسل پھیلا رہے ہیں اور وہ بھی نہایت سنجیدہ اور مدلل انداز میں اور ان کا توڑ بروقت، شائستہ، مدلل اور موثر انداز میں اس طرح نہیں ہو رہا جتنا ہونا چاہیے۔ لیکن اس سلسلے میں آپ راقم سے زیادہ توقع نہ رکھیں.... کہ ہمارے پاس تو اپنی مثبت بات کہنے کے لیے وقت اور صلاحیت کی کمی ہے چہ جائیکہ ہم سلبی انداز میں کام کرنے والوں کی بیخ کنی میں بھی جُت جائیں اور ہمارا مثبت کام بھی رُک جائے۔

ہاں! کچھ لوگ اس میں لگے ہوئے ہیں اور فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں جیسے ہمارے دوست سید خالد جامعی صاحب ہیں۔ 'وضّاع کون؟' کے نام سے وہ ایک سیریز لکھ رہے ہیں اور ان کے حلقے کے کچھ افراد نے 'لفظ بلفظ' کے نام سے ایک ویب سائٹ بنائی ہے وہ بھی کام کر رہی ہے۔ ہم جامعی صاحب کو مشورہ دیں گے کہ ایک تو وہ ماہنامہ ساحل کے انٹرنیٹ ایڈیشن کا اجراء کریں تا کہ

وہ غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب کی اٹھائی گئی مغالطہ انگیزیوں کا بروقت جواب دے سکیں اور وہ لوگوں تک بروقت پہنچ بھی جائے۔ دوسرا مشورہ ہم ان کو یہ دیں گے کہ وہ اپنے پھیلے ہوئے تحریری کام کو متوسط ضخامت کی کئی کتابوں میں موضوع وار مرتب کر کے یا کروا کے چھپوا دیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے کسی ایسے ذہین ساتھی یا شاگرد سے معاونت لیں جو ایڈیٹنگ کے فن سے اچھی طرح واقف ہو۔

لاہور سے ڈاکٹر حافظ زبیر صاحب غامدی مکتب فکر کے خلاف مدلل، شائستہ اور علمی انداز میں لکھتے رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ دوسرے علمی منصوبوں میں مصروف ہوں لیکن ان سے بھی درخواست کی جانی چاہیے کہ وہ اس مقصد سے اپنے وقت کا کچھ حصہ ضرور نکالیں۔ اس کے لیے البرہان کے صفحات بھی حاضر ہیں۔

مولانا پروفیسر محمد رفیق چوہدری صاحب نے بھی غامدی صاحب کے حوالے سے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ چونکہ غامدی صاحب کے اولیں دور کے ساتھی ہیں لہٰذا انہیں خوب سمجھتے ہیں۔ وہ آج کل تفسیر قرآن لکھ رہے ہیں اور اس کی تکمیل کے خواہشمند ہیں (ہم بھی ان کے لیے دعا گو ہیں) اس لیے غالباً وہ فی الوقت کسی اور موضوع کی طرف راغب نہیں ہوں گے۔

سہ ماہی ’جی‘ میں نادر عقیل انصاری صاحب نے غامدی صاحب کی فکر کے حوالے سے جو کچھ لکھا وہ بہت عمدہ تھا۔ وہ غامدی مکتب فکر کے ساتھ طویل عرصہ رہے ہیں لہٰذا وہ انہیں خوب سمجھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی علمی، شائستہ اور دلکش ہے۔ انہیں مزید لکھنا چاہیے۔ ’جی‘ کی طباعت کسی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کے دلائل مضبوط ہوتے ہیں لیکن اسلوب میں ذرا سختی ہوتی ہے۔ ہم علماء کرام اور دیگر اہلِ علم سے جو اس موضوع پر لکھنا چاہتے ہیں، یہ درخواست کریں گے کہ آج کا قاری جذباتی اور مناظرانہ طرزِ تحریر کو پسند نہیں کرتا۔ جو بات بھی کیجیے، دلیل سے کیجیے، ٹھنڈے دل و دماغ سے کیجیے، شائستہ انداز میں کیجیے۔ یہ اسلوب آج کے قاری کو متاثر کرتا ہے اور یہی آپ کی کوشش ہونی چاہیے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۴)

اتحادِ امت/توہین رسالت　　مدیر

مسلم امہ کا بنیادی مسئلہ اور اتحادِ امت میں سب سے بڑی رکاوٹ

مغرب کا فکری و عملی غلبہ

مؤتمر عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل راجہ ظفر الحق صاحب سے ایک ملاقات

۲۰ فروری ۲۰۱۷ء کو ہم راجہ ظفر الحق صاحب سیکرٹری جنرل مؤتمر عالم اسلامی سے ملنے موتمر کے اسلام آباد دفتر گئے۔ ان سے دو امور پر بات ہوئی۔ ایک مسلم امہ کے اتحاد کے حوالے سے اور دوسرے توہینِ رسالت کے حوالے سے۔ دونوں کے بارے میں راجہ صاحب کے خیالات جان کر ہمیں حیرانی بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔

مسلم امہ میں اتحاد کے حوالے سے ہمارے استفسار کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اس ضمن میں کوئی بڑا کام نہیں ہوسکتا کیونکہ سارے مسلمان ممالک مغرب کے فکری، سیاسی، معاشی، حربی غلبے کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور کسی میں ہمت و جرأت نہیں کہ مغرب کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکے۔

توہینِ رسالت کے حوالے سے، ملی مجلس شرعی کا ایک کتابچہ دیکھ کر، بات انہوں نے چھیڑی اور ممتاز قادری شہیدؒ کے موقف اور ان کی حمایت کرنے والے علماء کرام کے موقف کی صحت پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا۔ ہم نے نواز شریف حکومت کے غیر اسلامی رویوں کی بات کی تو انہوں نے اس کا بھی دفاع کیا۔

ہم مؤتمر کے دفتر سے باہر آئے تو محترم راجہ صاحب کی گفتگو سن کر اور طرز عمل دیکھ کر اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ واقعی مغرب کا فکری اور عملی غلبہ مسلم فرد، معاشرے اور ریاست پر حاوی ہو چکا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اتحاد امت کے لیے کام کرنے والی تینوں تنظیمیں او آئی سی، رابطۂ عالم اسلامی اور مؤتمر عالم اسلامی غیر فعال ہیں۔ موتمر کے بانیوں میں سے ایک، علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا کہ ؎

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

اور یہ کہ ؎

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تُو
مجھ کو تو گِلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

کسی مسلمان حکمران میں یہ جرأت نہیں کہ مغرب کی مرضی کے خلاف اتحادِ عالمِ اسلامی کی بات کرے یا اس کے لیے کوئی قدم اٹھائے۔ شاہ فیصل مرحوم نے اس کی جرأت کی تو ان کا انجام دیکھ کر یار لوگوں نے عبرت پکڑی۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ مسلم دنیا کے دانشوروں کی ایک بڑی تعداد بھی مغرب کی لادین فکر وتہذیب کے ہاتھوں مفتوح ہو چکی۔ مسلمان عوام کے دل آج بھی اتحاد امت کے لیے تڑپتے ہیں لیکن وہ زیرک اور جرأت مند قیادت سے محروم ہیں لہٰذا کچھ نہیں کر سکتے سوائے آرزوئں کے.... تاہم یہ آرزو بھی مبارک ہے اور اسے زندہ رہنا چاہیے۔ آدمی خواب دیکھنا ترک نہ کرے تو ایک نہ ایک دن اس خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے اور پھر ہمتِ مرداں، مددِ خدا کے نتیجے میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک اس صورتِ حال کا حل یہ ہے کہ عالم اسلام کے وہ دانشور اکٹھے ہو جائیں جو مغربی استعمار کی اسلام اور مسلم دشمن حکمت عملی کو سمجھتے ہیں۔ وہ متحد ہو جائیں، امہ کو فکری رہنمائی مہیا کریں اور اسے مغرب کی فکری اور عملی غلامی سے نکالنے کے لیے علمی اور عملی کام کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان اس کام کے لیے موزوں میزبان ہو سکتا ہے۔

البرہان اس قسم کی اتحادِ امت کی پہلی عالمی کانفرنس منعقد کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ہم امت کا درد رکھنے والے اور اتحاد امت کی آرزو رکھنے والے احباب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہم سے رابطہ کریں تا کہ یہ کانفرنس منعقد کی جا سکے۔

مغرب کی الحادی تہذیب کے فکری غلبے کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ راجہ ظفر الحق جیسا دینی ذہن رکھنے والا مدبر بھی توہینِ رسالت کے مرتکب فرد کی سزا کے بارے میں واضح ذہن نہیں رکھتا اور جمہور امت کے موقف کے بارے میں شکوک وشبہات رکھتا ہے۔ جب غازی ممتاز قادری شہیدؒ کا کیس چل رہا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ علماءِ امت اس کے بارے میں متحدہ موقف اختیار کریں تو ہم نے تحریکِ ختمِ نبوت کے ایک مہربان سے مولانا فضل الرحمن صاحب (امیر جمعیت

علماء اسلام) سے رابطہ کے لیے درخواست کی تو ان سے یہ سن کر حیران رہ گئے کہ مولانا فضل الرحمن صاحب اس ضمن میں جمہور علماء کے موقف کے بارے میں متردّد ہیں اور شاید جاوید غامدی و عمار ناصر کے پھیلائے ہوئے اس گمراہ کن موقف کے متاثرین میں سے ہیں کہ احناف کا موقف اس ضمن میں جمہور علماء سے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات بھی مغربی تہذیب کے فکری غلبے ہی کا شاخسانہ ہے (امریکہ و یورپ علی الاعلان قانون توہین رسالت کی مخالفت کر رہے ہیں اور اسے ختم یا کم از کم بے اثر کرنا ان کا ہدف ہے) کہ بعض مغرب زدہ سکالرز اس بات کو احناف کا علمی اور اختلافی موقف کہہ کر اور رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

مغرب کے فکری غلبے کے توڑ کے لیے بھی مذکورہ اہل علم اور اہل فکر کے متحدہ محاذ اور ان کی متحدہ علمی و فکری کاوشوں کی ضرورت ہے جو مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی کنہ اور باریکیوں کو سمجھتے ہوں تا کہ امت کو مغرب کی فکری غلامی سے نکالا جا سکے۔ جب تک ہم امت کو مغرب کی فکری غلامی سے نہیں نکالیں گے، اس کی عملی زندگی سے مغرب پرستی کو نکالنا ممکن نہیں ہوگا۔ لہٰذا مغرب کو علمی و فکری سطح پر چیلنج کرنا اور امت اور اس کے مختلف طبقات کو مغرب کی فکری یلغار سے بچانا اتحادِ امت اور عروجِ امت کا پہلا، ناگزیر اور اہم مرحلہ ہے جس کے لیے صحیح الفکر اہل دانش کو کمر کس لینی چاہیے اور اس کے لیے متحرک ہو جانا چاہیے۔

بقیہ: بچیوں کی تعلیم .... چند غور طلب پہلو

تعلیم اور ملازمت ملنے تک عمر بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور ایڈجسٹ ہونے میں بھی مشکل پیدا ہوتی ہے۔ شادی نہ ہو تو ماحول کی گندگی میں اخلاقی بے راہروی کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اگر مستقبل میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تعداد اسی طرح بڑھتی رہی اور سرکاری اور پرائیویٹ دفتروں میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، جو یقینی نظر آتا ہے اور ساتھ میڈیا کو فحاشی و عریانی کی جو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے، اور تعلیم کو مخلوط اور مادر پدر آزاد بنا دیا گیا ہے تو دفتروں میں اس بڑھتی ہوئی خواتین کی تعداد سے معاشرے کے لیے مزید اخلاقی اور معاشرتی مسائل کیوں پیدا نہ ہوں گے؟

ہے کوئی ان باتوں پر سوچنے اور غور کرنے والا؟

اسلام اور عصر حاضر

ڈاکٹر انعام اللہ[۱]

اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو

کرنے کا اصل کام ....اور کارِ دعوت سے تغافل

راقم کی طالب علمانہ رائے میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو کے حوالے سے سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا اپنا ''انتشار فکر'' ہے۔ہمیں کہا گیا تھا کہ ہم ''الکتاب'' کی محکمات کو حرز جاں بنائیں اور اس کی متشابہات میں نہ الجھ بیٹھیں لیکن ہم نے الکتاب کی متشابہات تو کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی متشابہات اور علماء کرام کی تشریحات کی متشابہات میں سینگ اڑا لیے۔ اسلام کی اصل، سیاسی تحریک کو شرع کرنا تھا تو دارِ ارقم اور صفہ کی نفسیات دیکھنی چاہیے تھی۔ اس کا نصاب اپنے دل میں جاگزیں کرنا تھا۔ اگر دنیا میں نظام قِسط اور توازن قائم کرنا تھا تو اصلاح کے لیے وہی طریق اولیٰ ہی کامیابی کا ضامن تھا۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ ایک ''الکتاب'' کی محکمات کے مختصر نصاب کی بجائے، ہر ہر مفکر کی بیسیوں کتابیں ہیں۔ ہر ہر مفکر اس بات پر مصر ہے کہ میری ہی فکر کے مطابق گاڑی آگے چل سکتی ہے۔اب ایسے سیکڑوں مفکر دنیا کے طول وعرض میں بکھرے پڑے ہیں۔

کوئی مفکر بیسیوں افراد کا مجمع اکٹھا کر لیتا ہے تو کوئی سیکڑوں کا،کوئی کامیاب مفکر ہزاروں کی تعداد میں اپنے پیروکار جمع کر سکتا ہے یعنی اس دنیا میں ایسے پہلوانی کے اکھاڑے سیکڑوں ہو سکتے ہیں جہاں کسی ایک کامیاب اکھاڑے میں جانثاروں کی تعداد چند ہزار سے تجاوز نہیں کر پاتی۔

عالمگیریت کے اس دور میں ایسے ہزاروں غیر منظم جانثاروں کا دنیا کی غالب سیاسی قوتوں کی منظم نیٹو افواج سے ٹکرا جانا وہی نتائج پیدا کرے گا جو پچھلے بیس سال سے ہم مشاہدہ کرتے چلے آرہے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ اسلامی دنیا اور اس سے بھی بڑھ کر پوری دنیا کے طول وعرض میں موجود مخلص مسلمان محققین اور مفکرین میں یہ اضطراب پایا جاتا ہے کہ امت کے اس سیاسی زوال کو کیسے دور کیا جائے۔

[۱] دار السلام کالونی، اٹک

امت کے مفکرین کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ پوری دنیا کو ایک آفاقی، عالمی اور کائناتی نظر سے دیکھیں، ایک بازیچۂ اطفال کی طرح۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

شاعر کے اُس دور میں تو شاید یہ ممکن نہ تھا، لیکن اب ہماری مٹھی میں یہ تفصیل بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔

خالق حقیقی کے دین کے علمبردار اپنے اندر وہ نظر اور ظرف پیدا کریں جو اس حکمران عقیدے کے مستقبل کے لیے درکار ہے۔ دنیا کو اس کا علم ہے۔ اس کی تفصیل فیوچر آف این یکل فیتھ (Future of an Emperical Faih) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی

البرہان سے وابستہ نوجوان، دنیا کے طول وعرض میں ''اظہار دین'' کے لیے جو کام ہورہا ہے اس کا ایک دائرۂ معارف (انسائیکلوپیڈیا) بنائیں۔ ایسے لگتا ہے کہ بہت سارے کام جگہ جگہ ایک طرح سے سمیٹے جارہے ہیں۔ دنیا کے ایک کونے والے کو خبر نہیں کہ دوسرے کونے میں اس کے کام کے بارے میں کہیں زیادہ پیش رفت ہوچکی ہے۔ دوبارہ سے اس کام میں مغز کھپائی کی ضرورت نہیں بلکہ سفر کو اس سے آگے شروع کیا جائے تاکہ فاصلہ مستقیم طے ہو۔

اجماع (وحدت فکر) کے بعد یہ اِنسیاب (Streamlining) وقت کی اہم ضرورت ہے۔

کسی قابلِ ذکر سیاسی تبدیلی کے لیے ایک جیسی فکر رکھنے والے افراد چاہئیں۔ اس عالمی دور میں ان کی تعداد ہزاروں یا لاکھوں نہیں بلکہ دنیا کے طول وعرض میں کروڑوں ہونی چاہیے۔ ایسے کروڑوں افراد میں سے عمل کی دنیا کے شاہسوار ایک دو فیصد ہی ہوتے ہیں۔

فکر کی ایسی تبدیلی کے لیے ''الکتاب'' کے محکمات کو از بر کرنا ضروری ہے۔ اسی بنیادی نفسیات پر عمل پیرا ہونا ہی مستقبل کی سیاسی تبدیلی کی نوید بن سکتا ہے اور تبھی دار ارقم اور صفہ کے ادارے سے مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے۔

[البرہان: ڈاکٹر انعام صاحب کی یہ بات کہ محکمات قرآن اور سیرت نبوی کو سیاسی فکر کی

اساس بنایا جائے اپنی جگہ درست ہے لیکن اس سے ہمارا پیش کردہ مقدمہ کہ اجتہاد کی بنیاد پر اسلام کے سیاسی نظام کی تفصیلات وضع کی جائیں، اس سے کمزور نہیں ہوتا کیونکہ قرآن وسنت اور سیرت کی محکمات ان تفصیلات کا حصہ ہوں گی اور ان کی بنیاد ہوں گی۔ مدیر]

کارِ دعوت کی اہمیت

البرہان کے پچھلے شمارے میں چین سے متعلق خدشات کا اظہار کیا گیا تھا۔ اصل میں ہم خود مجرم ہیں۔

ہم اپنا رب کہکشاؤں کے مالک کو ٹھہراتے ہیں اور دنیا کے بونوں سے ڈرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر پاکستانی اشرافیہ (اسٹیبلشمنٹ) نے چین کو نیا آقا بنانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ چین والے خود کو ''عباد الدینار'' کہتے ہیں۔ خریدار ان کا خدا ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ اپنے آہنی یا چوبی پردے سے باہر نکلے جس میں وہ ماضی میں مستوار یا محصور تھے۔

بلوچستان میں چینی آبادی کا مقامی آبادی سے زیادہ ہوجانا، ان شاء اللہ، ہمارے دین کی اشاعت کے لیے زیادہ سازگار ہوگا۔ سیاحت کے بغیر بھی شباب اور شراب کو کون روک سکا ہے؟ ہمارے لیے سوچنا یہ ہے کہ اگر چینی اپنی سخت گیر سرحدوں سے باہر نکل رہے ہیں تو انہیں اصل دین کی طرف کیسے راغب کیا جا سکتا ہے؟ اگر انہیں انسان (الناس) بنایا گیا ہے تو بے چین روحیں تو ان میں بھی ہوں گی۔ ماضی میں بھی چین کے ملحقہ علاقوں سے آنے والی حملہ آور نسلیں (چنگیز اور ہلاکو) کعبے کو پاسبان دے گئی تھیں۔ اس وقت وہ آئے بھی دشمن کے طور پر تھے۔ اب تو وہ دوستوں کے روپ میں آ رہے ہیں۔ وہ ہم سے ہمارا عمدہ اسلامی نظریہ چُرا سکتے ہیں۔ کمیونزم کا نظریہ پہلے ہی سے شکست خوردگی کے شکار ہے جبکہ دنیا اسلام کے حقیقی نظریے اور اس کی اصل بنیادوں کی تلاش میں تگ ودو کر رہی ہے۔

ہم اس قوم سے عزم، نظم اور وحدت سیکھ سکتے ہیں۔ یہ سودا کوئی مہنگا نہیں ہے۔ ہم سے جو غلطی ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں کون سے اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ ان میں سے ایمان لانے والوں کو مشوش (کنفیوز) نہ کیا جائے کہ وہ پوچھتا ہی رہ جائے کہ کس مارکہ (برانڈ) کا اسلام لاؤں؟

امریکہ کے نئے 'مکی ماؤس' سے بھی نہ ڈرا جائے۔ یہ بہتر ہے کہ ان کے دل کی بات بغیر کسی

لاگ لپٹ کے ان کی زبانوں پر آجائے۔ یہاں کے تذبذب کا شکار راہ پالیں گے۔مودی کے آنے پر بھی لوگ تشویش کا شکار ہو گئے تھے۔

یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود

اسرائیل، انڈیا اور امریکہ میں ان قوموں کے انتہا پسند حکمران بن چکے ہیں۔اس سے آگے ان قوموں کے پاس کوئی اور انتہا نہیں ہے۔اس کے بعد ان کی پسپائی ہے اور اگر ربّ کریم نے اس دنیا کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر رکھا ہے تو پھر دوبارہ سے ہر کچے پکے مکان میں دین نے داخل ہونا ہے۔اگر پہاڑوں اور غاروں میں جانے کا وقت نہیں آیا تو پھر ہم نے یہیں 'رباط' کرنا ہے۔

اپنی امت کی نوجوان نسلوں کو اصل دین سکھا کر اس عالمی دعوتِ مبارزت اور مسابقت کا سامنا کرنا ہے۔اپنے سیاسی نظام کی تشکیل کے لیے اپنی فکری، قولی اور عملی توانائیاں جمع کرنی ہیں۔ یہی قوموں کی امامت کا نقطۂ آغاز ہے۔

بقیہ: نہی عن المنکر کون کرے گا؟

ہم علماء کرام، دینی سکالرز اور محبّ اسلام افراد اور اداروں کی خدمت میں عرض کریں گے کہ میڈیا کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود میڈیا کے موثر ابلاغی کردار سے صَرفِ نظر اب ممکن نہیں۔اس لیے سب لوگوں کو اب میڈیا خصوصاً سوشل میڈیا کو اہمیت دینی چاہیے، اس کے لیے وسائل مہیا کرنے چاہئیں اور اس کے لیے افراد تیار کرنے چاہئیں تاکہ دینی حوالے سے میڈیا میں موثر کام کیا جاسکے۔

ہم احباب کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائیں گے کہ کوئی صاحب یا کوئی ادارہ غامدی مکتب فکر کے تجزیاتی وتنقیدی مطالعے کے حوالے سے تمام تقریروں، تحریروں، کتب، اخبارات، جرائد اور ٹی وی کی بحثوں وغیرہ کو انٹرنیٹ پر اور کتابی صورت میں ایک جگہ جمع کردیں تاکہ جو لوگ غامدی صاحب کی فکر سے متاثر ہو رہے ہیں وہ اگر تقابل کے لیے دوسرا نقطۂ نظر بھی جاننا چاہیں تو وہ مرتب ومدون انداز میں ایک جگہ انہیں مل جائے تاکہ انہیں ایک متوازن رائے قائم کرنے میں آسانی رہے۔

مطالعۂ کتاب مدیر

'سیکولرزم'

مولف ڈاکٹر سفر الحوالی - مترجم محمد زکریا رفیق

ہر عہد کا ایک فتنہ ہوتا ہے اور عصر حاضر کا فتنہ مغربی فکر و تہذیب ہے۔ مسلمان چونکہ دین سے دور اور کمزور ہیں اور مغربی فکر و تہذیب دنیا پر غالب ہے اور اس کی علمبردار اقوام اپنے سیاسی، حربی، معاشی، تعلیم، ثقافتی تفوق سے اپنی فکر و تہذیب کو نہ صرف پر امن طریقے سے دنیا میں اور خصوصاً اسلامی ممالک میں پھیلا رہی ہیں بلکہ بعض اوقات دباؤ، دھونس اور قوت کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔

مسلمانوں کے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں الحاد اور بے دینی پر استوار ہیں۔ ہیومنزم خدا کی خدائی کے انکار اور اس کی جگہ انسان کی خدائی کے اقرار پر مبنی ہے۔ اس کا دوسرا بڑا نظریہ سیکولرزم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو خدا اور آسمانی ہدایت (یعنی مذہب) کو ماننا ہے تو اپنی انفرادی اور ذاتی زندگی میں مان لے لیکن اجتماعی زندگی میں، معاشرے اور ریاست میں، خدا اور مذہب کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں بلکہ یہاں انسان کی اپنی مرضی چلے گی کہ وہ خود اپنے لیے اصول بنائے، ادارے کھڑے کرے، نظام وضع کرے اور جیسے چاہے اپنی زندگی کی صورت گری کرے۔ ظاہر ہے یہ چیز اپنی بنیاد میں غیر اسلامی ہے، الحاد پر مبنی ہے، اس کی موجودگی میں خدا اور مذہب کی بالادستی اور حتمیت ختم ہو جاتی ہے بلکہ خدا انسانی خواہشوں، آرزؤں اور ارادے کے تابع ہو جاتا ہے۔

مسلمان چونکہ دین کی حقیقت سے دور ہونے اور اپنے منابعِ قوت سے محروم ہونے کی وجہ سے روبہ زوال تھے لہٰذا طاقتور مغربی اقوام نے انہیں شکست دے کر اپنا محکوم اور غلام بنا لیا۔ ان کی ذہن سازی اور شخصیت سازی کا ڈھانچہ توڑ دیا، اجتماعی نظم کے سارے اداروں کی اپنی فکر کے مطابق تشکیلِ نو کی اور اس طرح مسلمانوں کو اور ان کی آئندہ نسلوں کے دل و دماغ کو فتح کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اسی لیے اقبال نے اپنے نوجوانوں کے بارے میں کہا ہے کہ۔

دل توڑ گئی اس کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ اس کی پریشاں نظری کا

ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے سربرآوردہ اور مقتدر طبقات (سیاستدان، سرمایہ دار، جاگیردار، عدلیہ، فوج، بیوروکریسی....) نے مغرب سے مرعوب ہوکر اس کی فکری بالادستی قبول کرلی۔ بلاشبہ علماء کرام نے استعمار کی مزاحمت کی لیکن ان کو شکست اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان اور دوسرے مسلم معاشروں میں انہوں نے دین کے بنیادی ڈھانچے کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے دینی مدارس قائم کیے۔ لیکن مغرب کی فکر کو پڑھنے، سمجھنے اور اسے فکری و علمی سطح پر رد کرنے کے کام میں وہ پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے مغرب سے نفرت کے ردعمل میں مغرب کی زبان سیکھنے اور اس کے فکری ماخذ اور علوم کو سمجھنے کی بھی کوشش نہ کی۔ اس طرح مغرب کے فکری اور علمی ردّ کا کام ان سکالرز کے حصے میں آیا جو ذہین تھے، مغرب کی لادین فکر و تہذیب کو سمجھتے تھے اور دوسری طرف اپنے ماضی سے بھی جڑے ہوئے تھے، اسلامی علوم سے بھی پیوستہ تھے اور دین کے عصری تقاضوں سے بھی آگاہ تھے۔ ہمارے ہاں اس طرح کے لوگوں میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ، ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ، عبدالماجد دریا آبادیؒ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقیؒ (اور بہت سے دوسرے) بلکہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ابوالکلام آزادؒ کو بھی اسی زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ شرق اوسط میں الاخوان المسلمون نے بھی ایک پوری کھیپ اس طرح کے لوگوں کی تیار کی جن میں سے ایک سید قطب اور ان کے بھائی محمد قطب بھی ہیں۔ سید قطب نے گمراہ اور ظالم حکمرانوں اور آمروں سے ٹکر لی اور شہادت کا رتبہ پایا۔ محمد قطب نے سعودی عرب میں جلاوطنی اختیار کی اور تاعمر وہاں اپنی فکر کے دیے جلاتے رہے۔

جب وہ مدینہ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے تو انہوں نے ماجستیر (ہمارے ہاں کا ایم فل) کے ایک سعودی طالب علم سفر الحوالی سے العلمانیہ (سیکولرزم) کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھوایا۔ (بعد میں سفر الحوالی نے پی ایچ ڈی کیا، یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی رہے اور اور تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے)۔ ہماری زیر تبصرہ کتاب ایم فل کے اسی مقالے کا اردو ترجمہ ہے۔

اس مقالے میں ڈاکٹر سفر الحوالی، سیکولرزم کے نظریے اور عملی زندگی میں اس کے اطلاق کے سارے پہلوؤں کا دقّت نظر سے جائزہ لیا ہے۔ مصنف نے (اردو میں) ۵۵۲ صفحات کے

اس مقالے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سیکولرزم کے پس منظر کو واضح کرنے کے لیے عیسائیت پر دو باب ہیں۔ دوسرے حصے میں یورپ میں سیکولرزم کی تشکیل وتوسیع پر مصنف نے چار ابواب میں گفتگو کی ہے۔ تیسرے حصے میں یورپ پر سیکولرزم کے اثرات کے حوالے سے مصنف نے سیاست، قانون، معیشت، معاشرت، ادب، فلسفہ، نفسیات وغیرہ پر سات ابواب میں بحث کی ہے۔ چوتھا حصہ اسلامی زندگی پر سیکولرزم کے اثرات سے متعلق ہے اور اس میں مصنف نے پانچ ابواب میں عالمِ اسلام کی سیاست، معاشرت، تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر سیکولرزم کے اثرات کا مصنف نے جائزہ لیا ہے۔ حصہ پنجم میں سیکولرزم کی شرعی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں تین اہم ضمیمے ہیں۔

ترجمہ سہل اور رواں دواں ہے، اگرچہ بعض جگہ بہتری کی گنجائش محسوس ہوتی ہے۔ مترجم نے آخر میں کتابیات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ مصنف کے بارے میں مترجم نے کتاب کے آخر میں ٹائیٹل کی پشت پر ایک صفحے میں حالات زندگی دیے ہیں جو ناکافی محسوس ہوتے ہیں۔ مترجم کو چاہیے تھا کہ کم از کم پانچ سات صفحات میں مصنف کا تفصیلی تعارف کرواتے۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب سیکولرزم کے تنقیدی مطالعے پر ہمارے ہاں موجود لٹریچر میں ایک اہم اضافہ ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں اور یہ لاہور میں کتاب سرائے (اُردو بازار 042-37320318) اور کراچی میں فضلی بک سپر مارکیٹ (اُردو بازار 021-32629724) سے دستیاب ہے۔

تبصرہ کتب ڈاکٹر محمد امین

'جمہوریت اور شورائیت۔ ایک تقابلی مطالعہ'

از عطا محمد جنجوعہ

اسلام کے اجتماعی ادارے خصوصاً اس کا سیاسی نظام آج کیوں کسی ملک میں نافذ اور فعال نہیں ہے؟ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ان دو سوالوں کے واضح جواب جناب عطا محمد جنجوعہ صاحب نے اس کتاب میں دیے ہیں۔

اس معاملے پر غور کے دو پہلو ہیں: داخلی طور پر ہمارے حکمران مجرم ہیں کہ وہ اسلام کے تفصیلی سیاسی نظام کی صورت گری کرنے اور اسے نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہماری سیاسی دینی جماعتیں مغربی جمہوریت میں چند اسلامی اصول داخل کر کے اسے اسلامی جمہوریت سمجھے بیٹھی ہیں اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود اپنے موقف پر نظر ثانی کے لیے تیار نہیں۔ ہماری تبلیغی اصلاحی تحریکیں اور دینی مدارس مغربی فکر و تہذیب کی ہلاکت خیزی کو سمجھنے اور اسلام کے اجتماعی اور سیاسی اداروں کو مسلم معاشرے میں روبہ عمل لانے کی اہمیت تسلیم کرنے سے عاری ہیں اور ہماری یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم سیاسیہ و علوم اسلامیہ مل کر عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کی تفصیلات وضع کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ علمی و تحقیقی کام کرنے کی اہمیت سے غافل ہیں۔ ان حالات میں مسلمان عوام کو کیسے دوش دیا جائے کہ وہ مغرب کی لادین جمہوریت کو قبول کیے بیٹھے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ووٹ سے تبدیلی اور خصوصاً اسلامی تبدیلی آجائے گی۔

دوسری طرف خارجی دائرہ ہے جس میں مغرب نے اپنے اجتماعی اداروں خصوصاً اس کے سیاسی نظام 'جمہوریت' کو ایک مقدس عقیدے کی طرح دنیا بھر میں متعارف کرایا ہے بلکہ علی الاعلان اسے اپنی سیاسی، معاشی اور حربی قوت سے مسلمان معاشروں میں نافذ کرا اور کروا رہا ہے اور اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل اور روبہ عمل آنے کے سارے راستے اس نے پُرامن حکمت عملی اور حربی قوت دونوں کے استعمال سے مضبوطی سے بند کر رکھے ہیں۔

ان حالات میں ہمارے جیسے اور عطا محمد جنجوعہ صاحب جیسے لکھنے والے اس کے سوا کیا کریں کہ سوئی ہوئی قوم کو جگائیں، حکمرانوں کو ان کی نااہلی پر متنبہ کریں، دینی قوتوں کو ان کا فرض یاد دلائیں، سکالروں اور محققوں کی خدمت میں عرض کریں کہ خدارا جاگو اور تحقیق کا پٹارہ کھولو۔ وہ قوم کے پڑھے لکھے طبقوں کو جھنجھوڑیں کہ مغرب کی فکری اور سیاسی غلامی کو سمجھو، اس سے نکلو اور حریت فکری سے کام لیتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام پر عمل کے راستے ہموار کرو۔

ہمیں خوشی ہے کہ عطا محمد جنجوعہ صاحب اس عظیم کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے کام میں برکت عطا فرمائے، معاشرے میں اس کے اچھے اثرات پیدا فرمائے اور انہیں استقامت اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ کتاب پریس میں زیر طبع ہے۔ اس کے حصول کے لیے مکتبہ البرہان سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔